شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک

مولانا عبیداللہ سندھی

سِندھ ساگر اکادمی لاہور

شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک

یعنی

حزبِ ولی اللہ دہلویؒ کی اجمالی تاریخ کا مقدمہ

حضرت مولٰینا عبید اللہ سندھی

سندھ ساگر اکادمی لاہور

قیمت   فروری سنہ ۱۹۴۴ء   عہ ۱۲/

مرکنٹائل پریس لاہور میں محمد صدیق پرنٹر پبلشر نے چھپوا کر سندھ ساگر اکادمی
۵۸ ٹمپل روڈ لاہور سے شائع کی۔

پیش لفظ

(اشاعت دوم)

حضرت مولٰنا عبید اللہ صاحب سندھی کی تصنیف "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کو اب دوسری بار شائع کیا جا رہا ہے۔ کتاب مذکور کی پہلی اشاعت خواص اور طبقۂ علمار کے لئے تھی۔ اس اشاعت میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کے مطالب ایسے اسلوب اور زبان میں ادا ہوں کہ عام پڑھے لکھے اردو داں حضرات بھی ان سے مستفید ہو سکیں۔

اصل کتاب دو حصّوں پر مشتمل تھی۔ ایک تو کتاب کا متن تھا، جو حضرت مولٰنا نے خود اپنے قلم سے رقم فرمایا تھا۔ اور دوسرے حواشی جو مولٰنا نور الحق صاحب علوی پروفیسر اورینٹل کالج لاہور نے مرتب کئے تھے۔ اشاعت اوّل میں کتاب کا متن اوپر تھا۔ اور حواشی اس کے نیچے۔ بیشک متنِ کتاب کی اہمیت سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہی اصل کتاب ہے۔ لیکن مولٰنا نور الحق صاحب نے حضرت مولٰنا سے استفادہ کر کے، اور پھر اپنے وقتِ مطالعہ، وسعت معلومات، تحقیق اور استقصار سے حواشی کو اتنا مفید اور اہم بنا دیا تھا کہ متن کے بیانات، امر واقعہ یہ ہے کہ حواشی کے بغیر نامکمل اور ادھورے رہ جاتے۔ اس ضمن میں موصوف نے جو محنت فرمائی ہے، اس کی وجہ سے اصل کتاب کی اہمیت اور افادیت بھی بہت بڑھ گئی۔ اور حواشی کتاب

کے مضمون سے کوئی زائد چیز نہیں رہے بلکہ کتاب کے اصل مضمون کا ایک ضروری حصّہ بن گئے۔

اشاعت زیر نظر میں خاکسار مرتب نے یہ کیا ہے کہ ایک تو کتاب کے متن اور حواشی کے مضمون کو ملا دیا ہے لیکن جہاں کہیں حاشیے کا مضمون سلسلۂ بیان میں کھپ نہیں سکتا تھا۔ اُسے یا تو نیچے حاشیہ میں لکھ دیا ہے۔ اور زیادہ کتاب کے آخر میں ضمیمہ جات کی شکل میں آ گیا ہے۔ مرتب کا دوسرا کام یہ ہے کہ متن اور حواشی میں فارسی اور عربی کی جو عبارتیں تھیں۔ اور وہ کافی تعداد میں تھیں۔ ان کا عام فہم اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ نیز کتاب کے مضامین کی ترتیب میں کچھ گنجلک تھی۔ مرتب نے اُسے بھی سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور آخر میں جہاں تک کہ اس سے ہو سکا، اور جس حد تک کہ موقعہ اور محل اجازت دیتے تھے۔ مرتب نے زبان اور پیرایۂ بیان کو آسان کرنے کی جرأت کی ہے، میرا خیال ہے کہ اسکے بعد ہمارے متوسط طبقوں کے لئے اس کتاب کا سمجھنا مشکل نہ رہے گا۔

میں نے اصل کتاب کے مطالب اور حواشی کے مضامین میں کہیں رد و بدل نہیں کیا۔ نیز اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ اشاعت اوّل میں جو بھی مضامین آ چکے ہیں، اس اشاعت میں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ چھوٹے۔ الغرض کتاب کا نقشِ ثانی ممکن ہے ظاہری شکل و صورت میں نقشِ اوّل سے قدرے مختلف ہو۔ لیکن جہاں تک مطالب کا تعلق ہے۔ نقشِ ثانی بعینہٖ نقشِ اوّل کی شبیہ ہے۔

محمد سرور

جنوری ۱۹۴۴ء — بیت الحکمت ۔ جامعہ نگر
دہلی

عرضِ مرتب (حاشیہ)

(اشاعتِ اوّل)

کمشتبضیع تنمرالی ارہض خیبراً

زیرِ نظر مقالہ حضرت مولینا عمّ فیضہم نے خود اپنے قلم سے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو شروع کر کے ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو ختم کیا۔ مقالہ جدید حقائق کا مرقع ہونے کے علاوہ بھولی ہوئی تاریخ کا تذکرہ اور محرف کردہ واقعات کی اصلی تصویر ہے۔ اس سے اس میں اغلاق کا پیدا ہونا ضروری امر تھا۔ ساتھ ہی حضرت نے مقالے کو مختلف قطعات کی صورت میں قلم بند فرمایا۔ بنا بریں میں نے محسوس کیا کہ خود حضرت مولینا سے سبقاً پڑھ کر ہی اسے حل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت نے کمال شفقت سے مقالہ مذکورہ مجھے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۱ء سے پڑھانا شروع کیا جو تین مجلسوں میں ۲۶ اکتوبر کو ختم ہوا۔ مشکل اور مغلق مقامات پر جو کچھ آپ ارشاد فرماتے۔ میں ساتھ ساتھ قلم بند کرتا جاتا یا بعد ازاں حافظے سے کام لے کر صفحۂ قرطاس پر لے آتا۔ ایسے تمام مقامات پر میں نے حضرت کا حوالہ ضروری سمجھا۔ اس کے علاوہ حضرت کی کتاب "التمہید لائمۃ التجدید" سے میں نے ضروری اقتباسات جا بجا نقل کر کے اشکال کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ماسوا تاریخی مستندات سے بھی مناسب مقامات پر حوالے نقل کر کے واقعات کی توضیح کی گئی ہے۔ بعض مقامات پر تکرار محسوس ہوگا۔ مگر حواشی میں ہونے کے علاوہ اس قسم کے فراموش شدہ حقائق و واقعات اور

محرف کردہ تاریخ میں تکرار گوارا کیا جا سکتا ہے، تا کہ تحریف کا پُرانا داغ کسی صورت سے مٹ سکے۔

اس اہم کام میں جس قدر عجلت اور روا روی برتی گئی ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ اتنا بڑا تاریخی، علمی اور حکمت کا خزانہ ۲۵ اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء کو شروع ہو کر ۱۱ نومبر کی سحر کو ختم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ مجھے اپنے ذاتی اور منصبی فرائض کے ادا کرنے سے بھی چارہ نہ تھا۔ زیادہ وقت اُدھر صرف کرنا پڑتا تھا۔ ان حالات میں ان تمام کوتاہیوں کو میں اپنے ذمہ لیتا ہوں، جو ناظرین کرام کو مقالے کی ترتیب و تالیف میں نظر آئیں گی ؎

نہ گلم نہ برگِ سبزم، نہ درختِ سایہ دارم
ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت ما را

ھذا مالزم محمد نور الحق العلوی

تاج پورہ لاہور

عرضِ حال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

اما بعد۔ ۱۹۱۵ء میں ہم کابل پہنچے۔ چونکہ یہ سفر ہم نے حضرت مولٰینا شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے فیصلے کی تعمیل میں اختیار کیا تھا۔ اس لئے وہ تاریخ ہند کا ایک اہم تاریخی واقعہ بن گیا۔ غالباً ڈاکٹر سر اقبالؒ نے خضر راہ میں ہمارے ہی حضر و سفر کا ذکر کیا ہے۔ ع

وہ حضر بے برگ و ساماں۔ وہ سفر بے سنگ و میل

کابل میں سات برس رہ کر ہم نے اس مسئلے کے سمجھنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کی تاریخ کا آج کی دنیا سے کیا تعلق ہے؟ ہمیں آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا کہ ہمارے ملک میں چند نفوس عالیہ حقیقت شناس تو ضرور موجود ہیں، جنہوں نے فراستِ خداداد سے تاریخ کو صحیح طور پر سمجھ لیا ہے۔ یا جنہوں نے یورپ میں رہ کر دُنیا کے انقلاب کا مطالعہ کیا ہے۔ ورنہ عام طور پر ہمارے مفکرین ع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کے مصداق ہیں۔

اس کے بعد ہم نے یورپ پہنچ کر انقلابِ فرانس اور اس کے نتائج کا

عمیق مطالعہ کیا تو ہمیں اضطراب کے اس سمندر میں جو عالمگیر کے بعد تاریخ ہند میں موجیں مار رہا تھا۔ روشنی کا ایک مینار نظر آیا۔ اور وہ امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک تھی۔ چنانچہ اس تحریک کے انقلابی اصول ہم نے مکہ معظمہ میں بیٹھ کر معین کئے۔

بفضلہ تعالےٰ اس قدر وسعتِ فہم پیدا ہونے کے بعد ہم امام ولی اللہ کی تحریک کو کارل مارکس کے نظریات کے مقابلہ میں دنیا کے لئے زیادہ مفید ثابت کر سکتے ہیں۔ اس کے نتیجہ کے طور پر جو انقلاب ہمارے دماغ میں پیدا ہوا اس کا لازمی اثر ہے کہ واقعہ بالاکوٹ کے بعد جس قدر نئی تحریکیں ہندوستان میں پیدا ہوتی رہیں، ان میں سے کسی ایک کو بھی ہم صحیح نہیں مانتے۔

اس وقت ہم اس اجتماعی تحریک کے ایک مختصر مقدمہ کا تعارف کرانا چاہتے ہیں، جس میں امام ولی اللہ سے شیخ الہند تک اہم واقعات کا اشارۃً ذکر کر دیا ہے۔ اسے "مقدمہ تاریخ حزب ولی اللہ" (حزب ولی اللہ کی تاریخ کا مقدمہ) کہا جائیگا۔ امام ولی اللہ کی فلاسفی کی حقیقت جس طرح ہم سمجھتے ہیں، اسے ہم ہرگز سمجھا نہیں سکتے۔ جب تک اس تحریک کی تاریخ نہ پڑھا لیں۔ ہمارا "یہ مقدمہ" اس تاریخ کے لئے تمہید کا کام دے گا۔ اصل میں یہ کام نئی وطنی تاریخ کی تحقیق ہمارے ذہین نوجوانوں کا ہے۔ اگر وہ ادھر متوجہ ہوئے تو ہمارے اس فکر کی بنیاد پر ایک "ہسٹاریکل لاج" کھڑی کر دیں گے۔

حکیم الہند امام ولی اللہ نے ۱۲/ ذی قعدہ ۱۱۴۴ھ (۵/ مئی ۱۷۳۱ء)

سے دہلی کے مفاسد کو ختم کرنے کے لئے توکلاً علی اللہ اپنی ذمہ داری پر ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ غالباً اس سے پانچ سال پہلے وہ اس مطلب کے لئے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ۱۱۳۹ھ میں شروع کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

تاریخ ہند کا یہ عظیم الشان واقعہ انقلاب فرانس سے ۵۸ سال پہلے ہوا۔ حکیم الہند امام ولی اللہ نے اپنا نصب العین معین کیا۔ اپنے پروگرام کی تدوین کی۔ جمعیت مرکزیہ بنائی۔ اور اس کی شاخیں ملک میں پھیلیں۔ اس طرح حزب ولی اللہ ایک مسلم پارٹی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اس نے حکومت مؤقتہ (Provisional Govt) بنائی۔ لیکن ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) بروز جمعہ بالاکوٹ کے معرکۂ شہادت میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

اس صدی میں اس تحریک کے لئے تین امام ظاہر ہوئے۔ اور ایک امارت منعقد ہوئی۔

(۱) امام ولی اللہ ۱۷۳۱ء تا ۱۷۶۳ء

(۲) امام عبدالعزیز ۱۷۶۳ء تا ۱۸۲۴ء

(۳) امام محمد اسحاق ۱۸۲۴ء تا ۱۸۴۶ء

حکومت مؤقتہ کے امیر شہید سید احمد ۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۱ء

اس سال اس تحریک کا پہلا دور پورا ہوا۔ اس دور میں حزب ولی اللہ میں ایک ایسا انسان بھی پیدا ہوا۔ جو نہ امیر تھا، نہ امام۔ لیکن اپنی مبارک

زندگی اور شہادت سے اپنے جد امجد کی تحریک کو زندہ کر گیا۔ وہ مولینا محمد اسماعیل شہید بن عبد الغنی بن ولی اللہ ہے۔

اس تحریک کا دوسرا دور امام محمد اسحاق نے ۱۸۳۱ء سے شروع کیا۔ آپ ۱۸۴۱ء تک دہلی میں رہے۔ اور ۱۸۴۶ء تک مکہ معظمہ میں۔ دہلی میں ان کے نائب مولینا مملوک علی تھے، اور ان کے بعد امیر امداد اللہ بارہ برس تک دہلی میں رہے، یعنی ۱۸۵۸ء تک۔ اور اس کے بعد مکہ معظمہ چلے گئے۔

ہندوستان میں اُن کے پہلے نائب مولینا محمد قاسم ۱۸۷۹ء تک پھر مولینا رشید احمد ۱۹۰۵ء تک، اور ان کے بعد شیخ الہند مولینا محمود الحسن ۱۹۲۰ء تک اس تحریک کے سرپرست رہے۔ اس سال تحریک مذکور کا دوسرا دور ختم ہوا۔

تحریک کے تیسرے دور کو مولینا شیخ الہند نے ۱۹۲۰ء سے تھوڑا عرصہ پہلے شروع کیا تھا۔

عبید اللہ سندھی — بیت الحکمت دہلی

"متی اضع العمامۃ تعرفونی" — ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۱ء ہندی

فہرست مضامین

الصدر الحمید امام محمد اسحاق

حزب ولی اللہ کا دوسرا دور

حزب ولی اللہ کا تیسرا دور

ضمیمہ جات

۱- آصف جاہ
۲- مرزا مظہر جانجاناں
۳- اجتہاد
۴- شاہ صاحب کا الہامی خواب
۵- شاہ صاحب کی مستقل امامت
۶- مدرسہ شاہ ولی اللہ
۷- مولینا محمد اسحاق پھلتی
۸- مدرسہ نجیب آباد
۹- دائرۂ شاہ علم اللہ
۱۰- مُلّا محمد معین ٹھٹوی
۱۱- شاہ عبداللطیف بھٹائی
۱۲- معرکۂ پانی پت
۱۳- خروج مہدی کا عقیدہ
۱۴- انسانیت کے چار بنیادی اخلاق
۱۵- کسریٰ و قیصر کا نظام
۱۶- امام عبدالعزیز کا خواب
۱۷- یلغار نادر شاہ
۱۸- میر اویس
۱۹- احمد شاہ ابدالی
۲۰- ہندوستان کے افغانی صوبے
۲۱- فقہ حنفی
۲۲- ہندوستان میں شیعی دعوت
۲۳- مولینا رفیع الدین
۲۴- شیخ خالد کردی
۲۵- شیخ محمد بن عبدالوہاب
۲۶- طریقہ امام ولی اللہ
طریقہ محمد بن عبدالوہاب النجدی
۲۷- امام شوکانی
۲۸- امام ربانی مجدد الف ثانی
۲۹- سید احمد شہید کی تعلیم و تربیت
۳۰- ہیئت اجتماعیہ کے مدارج
۳۱- پنجاب کی سکھ حکومت

تعارف

محمد سرور

آج کل ہندوستان کی تاریخ کی نئی نئی تعبیریں ہو رہی ہیں۔ زیادہ دن نہیں گزرے کہ ہم سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں صرف انگریز مصنفوں کی لکھی ہوئی ہندوستان کی تاریخیں پڑھتے تھے۔ یہ لوگ ظاہر ہے برطانوی عہد کو سراہتے اور ہندو اور مسلمان دونوں کے زمانوں کو بُرا کہتے تھے، موجودہ قومی تحریک شروع ہوئی تو بھارت میں "انگریزی راج" قابل نفرت قرار پایا۔ اور ہندوستان کی تاریخ نئے ڈھنگ سے لکھی جانے لگی۔

ہندوستان کی موجودہ قومی تحریک کے ہراول بیشتر ہندو ہیں۔ شروع شروع میں اس تحریک کا سارا تار و پود بھی خالص ہندوانہ تھا۔ گو اصولاً یہ تحریک سارے ہندوستان کی تھی، لیکن عملاً کافی عرصہ تک یہ صرف ہندوؤں تک محدود رہی۔ اِس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان بحیثیت مجموعی اس قومی تحریک سے صرف بے تعلق ہی نہیں رہے بلکہ بڑی حد تک اس کی مخالفت بھی کرتے رہے، دوسری طرف ہندوؤں نے مسلمانوں کو بدیسی سمجھنا شروع کیا، اور ہندوستانی تاریخ

کا اسلامی عہد ان کی نظروں میں تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا گیا۔ بنگال کی تقسیم کے خلاف ہندوؤں کی جد و جہد اور مہاراشٹر والوں کی تحریک آزادی اور بندے ماترم کے گیت کا کانگرس کے پلیٹ فارم سے گایا جانا یہ سب اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں۔

یہ بات ان ہندو قوم پرستوں کے نقطۂ نظر سے ایک حد تک معقول بھی تھی۔ اگر انگریز کی حکومت جابرانہ ہے، اور اس کو ختم کرنا ہر ہندوستانی قوم پرور کا فرض ہے، تو مسلمان بادشاہوں کی حکومت اُن کی نظر میں برطانوی حکومت سے کیا کم جابرانہ تھی۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ انگریز کو تو بُرا کہا جائے اور مسلمان فرمانرواؤں کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ جن ہندو سرداروں نے مسلمان بادشاہوں کے خلاف بغاوتیں کیں وہ ان کے نزدیک بڑے وطن پرست قرار دئے گئے، سیواجی، گورو گوبند سنگھ آزادی ہند کے سورما بنے اور اورنگ زیب غاصب اور مستبد، اب مسلمان کیا کرتے؟ وہ لاکھ قوم پرست ہوں لیکن وہ اسلامی عہد اور مسلمان بادشاہوں کو بُرا کہہ کر نہ اپنا وجود قائم رکھ سکتے تھے اور نہ اپنی قوم کا وقار، الغرض ہندوستان کی تاریخ کا یہ مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی بہت بڑی خلیج ہے جس کا پاٹنا اس وقت مشکل نظر آتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات صاف ظاہر ہے کہ اورنگ زیب اور دوسرے مسلمان حکمران بادشاہی نظام کے محافظ تھے۔ اور سامراج ہی اُس عہد کا شعار تھا سیواجی اور گورو گوبند سنگھ کچھ بھی ہو عام ہندو رعیت کے نمائندے تھے، ان کی تحریک بیشک ہندو عوام کی تحریک تھی، یعنی مقابلہ ہندو عوام کا اور مسلمان

بادشاہ کا تھا۔ اس زمانے میں جب کہ جمہوریت اور ڈیموکریسی ہر شخص کا مذہب بن رہا ہے۔ اور "شہنشاہیت اور استبداد کی بربادی" کے نعرے ہر جگہ گونج رہے ہیں، مرہٹوں۔ راجپوتوں۔ سکھوں اور جاٹوں کی تحریکوں کو اس لحاظ سے بُرا کہنا بہت مشکل ہے، لیکن کسی مسلمان کی زبان اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف بھی آخر کیسے کھلے؟ اب دقت یہ ہے کہ ہندو قوم پرست جس عہد کو اپنی آزادی کی تحریک کا سنگ بنیاد قرار دیتا ہے اور اس کے لیڈروں کو اپنا پیشوا اور گورو۔ ہم اس کے برعکس اورنگ زیب کو بڑا خدا پرست بادشاہ مانتے ہیں، اور اس کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو بُرا کہتے ہیں۔ چنانچہ اس بناء پر مسلمان وطن دوست اور آزادیٔ ملک کے لئے ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے والے عجیب کشمکش میں گرفتار ہیں۔

مثال کے طور پر مولینا محمد علی مرحوم کو لیجئے۔ مرحوم شروع میں اس قومی تحریک سے بالکل الگ رہے تھے۔ چنانچہ ریاست بڑودہ کی ملازمت کے زمانے میں وہ اورنگ زیب کی حمایت اور سیواجی کی مخالفت کے سلسلے میں اپنے افسر کے معتوب بھی ہو چکے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جب مرحوم نے کانگرس میں شرکت کی تو اس وقت تک مسلمانوں کے کانگرسی تحریک سے علیحدہ رہنے کے لئے اُن کو وجہ جواز ڈھونڈنے کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ مرحوم نے اپنے خطبہ میں جو انہوں نے کانگرس کے صدر کی حیثیت میں کوکناڈا میں پڑھا تھا۔ نہایت تفصیل سے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ مسلمانوں کا شروع میں سیاست کے شجر ممنوعہ سے الگ رہنا بجا اور درست تھا۔ لیکن جب علی گڈھ کے قیام اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی عام اشاعت پر کافی عرصہ

گذر چکا اور ان میں سیاسی بیداری کے آثار نمایاں ہو چلے تو پھر مسلمانوں کے لئے کانگرس میں شریک ہونا ضروری ہو گیا یعنی دوسرے لفظوں میں مرحوم نے یہ مان لیا کہ آزادی کی موجودہ تحریک میں مسلمان بعد میں آئے، اور اس طرح اوّلیت کا سہرا ہندوؤں کے سر رہا۔ چنانچہ گاندھی جی قائد بنے اور محمد علی اور شوکت علی ان کے رفیق اور پیرو۔

مولانا مرحوم کو طبیعتاً یہ ثانوی حیثیت گوارا نہ تھی۔ چنانچہ ان کی ہندو کانگرسی زعما سے کبھی نہ بنی۔ خود گاندھی جی سے بھی جن کے وہ کسی زمانے میں بڑے عقیدتمند تھے انہیں آخر لڑائی لڑنا ہی پڑی۔ یہ اختلاف عارضی اور وقتی اسباب کی وجہ سے نہ تھا جیسا کہ بظاہر اس وقت لوگوں نے سمجھا۔ یہ تصادم تھا، دو مختلف ذہنیتوں کا۔ ہندو قوم پرست قومی تحریک کی قیادت کا دعویٰ دار تھا۔ وہ مسلمان کو صرف اپنا یار و مددگار سمجھتا تھا لیکن یہ کہ دونوں اس تحریک میں برابر کے ساجھی ہوں۔ یہ خیال گاندھی جی کے اساس فکر میں کبھی ممکن نہیں۔ "گاندھی ازم" آزاد ہندوستان کا سیاسی اور وطنی مسلک بننے کا مدعی ہے۔ گو مسلمان کی اس میں گنجائش ہے۔ لیکن محض مخلص پیرو کی حیثیت سے۔ ہندوستان کی قومی تاریخ کی اس تعبیر کا اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں نکل سکتا کہ مجبوراً جو مسلمان بھی ان حالات میں کانگرس میں جائے گا، مسلمان اُسے "خارجی" قرار دیں گے۔ ان دنوں عام مسلمانوں کی کانگرس کی موجودہ قیادت سے بیزاری کا اصل سبب بھی حقیقت میں یہی ہے۔ گاندھی جی نے قومی وطن اور قومی سیاست کا جو تصور اہل ملک کو دیا ہے، ہندوستان کا مسلمان اس میں اپنے لئے باعزت جگہ نہیں پاتا، اس لئے وہ نہ گاندھی جی کی قیادت کو مانتا ہے، اور نہ کانگرس کو اپنی قومی جماعت سمجھتا ہے۔

پیشِ نظر کتاب "شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک" کے مُصنف مولانا عبید اللہ صاحب سندھی ہندوستان کی تاریخ کی ایک نئی تعبیر پیش کرتے ہیں۔ اِس تعبیر کی رو سے ہر فرد، ہر گروہ اور ہر ملّت، اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے کُل ہندوستان کا جزو بن سکتی ہے۔ مولانا کے ہندوستان میں محمد بن قاسم کی بھی جگہ ہے اور سیواجی اور گورو گوبند سنگھ کی بھی۔ اس فکر کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں[۱]۔ البتہ مولانا نے پیشِ نظر کتاب میں اس ہندوستان کے ایک دور کا تعارف کرایا ہے۔ ہندوستان کے اکثر مورّخ اس دور سے بالکل ناواقف ہیں۔ ہندو مصنفین تک تو اس کی بھنک نہیں پہنچی۔ مسلمان اہل قلم بھی اس سے قطعاً بیخبر رہے۔ یہ دَور ہندوستان کے کسی فاتح اور کشورکشا مسلمان شہنشاہ کا نہیں نہ یہ کسی مسلمان سپہ سالار کا دَور ہے۔ اس دَور کی ابتدا ایک درویش صوفی سے ہوتی ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی سلطنت اپنے پورے عروج پر ہے۔ سلطنت کی حدوُد ملک کی انتہائی وسعتوں تک پھیل چکی ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیری سلطنت کی شان وشوکت اب ابدالآباد تک رہے گی۔ لیکن یہ درویش اس سلطنت کے روگوں سے واقف ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ بادشاہ بڑا خدا پرست اور انصاف پرور ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی سلطنت میں بعض خدا کے بندے محض اس لئے معتوب ہیں کہ وہ ہندو ہیں یا شیعہ۔ اس کا دل اس بات سے کڑھتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ کس طرح اس ملک میں سب مہر ومحبت سے رہیں۔ وہ سوچتا ہے لیکن کچھ کر نہیں پاتا، سلطنت کا شباب ہے، جوانی کے نشہ میں احتیاط کی باتیں کون سُنتا ہے؟ یہ درویش شاہ عبدالرحیم ہیں۔ ان کے صاحبزادہ شاہ ولی اللہ

[۱] مولٰنا عبید اللہ، حالات، تعلیمات اور سیاسی افکار" میں تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چل کر ہندوستان کی سوسائٹی کے لئے ایک ہمہ گیر صالح اور مفید اساس وضع کرتے ہیں۔ اس اساس کی ظاہری صورت شکل "اسلامی" ہے لیکن اپنے جوہر اصلی میں یہ ایسا فکر ہے جو تمام انسانوں میں مشترک ہے۔ اس فکر کی بنیادوں پر جو سیاسی اور اجتماعی نظام بنتا۔ وہ اکبر اعظم اور اورنگ زیب دونوں کے ہندوستان کو ترقی کے راستہ پر ایک قدم اور آگے لے جا سکتا تھا۔ شاہ ولی اللہ اس فکر کے موسّس ہیں۔ ان کے جانشینوں نے اپنی ایک جماعت بھی بنائی۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں بڑی گڑبڑ تھی۔ نئی نئی قومیں اور جماعتیں اپنے اپنے اقتدار کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں، شاہ ولی اللہ کی جماعت کو بھی اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے جد وجہد کرنی پڑی۔ اس جد وجہد نے کئی شکلیں اختیار کیں، لیکن اس جماعت کا اصل اصول بدستور اپنی اصلی حالت میں رہا اور اس میں کوئی کمی زیادتی نہیں ہوئی۔

شاہ عبدالرحیم دربار کے علماء میں سے نہ تھے۔ ان کے صاحبزادے شاہ ولی اللہ بھی درباری سیاست سے الگ ہی رہے۔ جس سال عالمگیر کے تخت پر سلطان محمد شاہ متمکن ہوا۔ شاہ ولی اللہ اپنے باپ کی مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہ ۱۷۱۹ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی تھی اور عام پڑھے لکھے مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔ شاہ ولی اللہ کا مشن عام مسلمانوں کے لئے تھا، اس لئے سب سے پہلے انھوں نے قرآن مجید کا عوام مسلمانوں کی زبان میں ترجمہ کرنا ضروری سمجھا۔ شاہ ولی اللہ کے جانشین ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز ہوئے جو ۱۷۶۳ء سے ۱۸۲۴ء تک دہلی میں درس دیتے رہے۔ اُن کے زمانے میں فارسی کی جگہ اردو لے رہی تھی۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز کے بھائی

شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کا ترجمہ اُردو میں کیا، اور ان کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل نے اُردو میں اور دینی کتابیں لکھیں۔ یعنی اس تحریک نے مسلمانوں کے حکمراں طبقوں کو اپنا محور نہیں بنایا۔ یہ عوام مسلمانوں کو اپنا پیغام سُنانا چاہتی تھی اور انھیں کی تنظیم اور جماعت بندی پر اپنے کام کی بنیاد رکھنا ضروری سمجھتی تھی۔

شاہ ولی اللہ خود فرماتے ہیں کہ سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ قیصر و کسریٰ کی سی خرابیاں مغلوں کی سلطنت میں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس لئے مصلحت خداوندی یہی ہے کہ اس نظام کو سرے سے توڑ دیا جائے۔ الغرض شاہ ولی اللہ کی تحریک مغلوں کی گرتی ہوئی شاہی عمارت کو تھامنے نہیں اٹھی تھی۔ وہ تو بادشاہی نظام کو فرسودہ اور بیکار ہوتا دیکھ رہے تھے۔ اس کے پنپنے اور باقی رہنے سے وہ مطلق نااُمید تھے۔ دراصل ان کی تحریک کا دارومدار عام مسلمانوں پر تھا۔ وہ زوال آمادہ اونچے طبقوں کی بجائے عوام کو ہندوستان کی بادشاہت حاصل کرنے کی دعوت دینی چاہتے تھے۔ شاہ صاحب چاہتے تھے کہ بداخلاق اور نااہل بادشاہوں اور امیروں کی جگہ عام مسلمان لیں۔ چنانچہ وہ اور ان کے جانشین شاہ عبدالعزیز سال ہا سال تک ان عوام کی تعلیم و تربیت میں لگے رہے۔ ان کی کتابوں، رسالوں اور وعظ و تدریس کا حاصل یہ تھا کہ سلطنت تو اب ہاتھ سے جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ بادشاہ امیر اور وزیر بھی جائیں گے۔ اب تک نظام سلطنت ان کے بل پر چلتا تھا۔ اب اگر عام مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنا ہے اور جن اعلیٰ افکار اور بلند مقاصد کو اچھے مسلمان فرمانروا اور خدا پرست صوفی ہندوستان میں قائم رکھے ہوئے تھے، انہیں اگر برابر جاری رکھنا ہے تو

اس کے لئے کسی اور اساس کی ضرورت ہے، جس پر ہندوستان کی نئی سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا سکے۔

شاہ ولی اللہ نے اس نئے ہندوستان کا تصور پیش کیا۔ شاہ عبدالعزیز نے اس تصور کو عام مسلمانوں کے لئے عام فہم بنایا اور ان کی زبان اور ان کے طور طریقوں پر اس تصوّر کی تلقین کی، شاہ اسماعیل اور سید احمد شہید نے اس تصوّر کے مطابق اپنی ایک جماعت بنائی اور اس جماعت کو لے کر وہ میدانِ عمل میں اُترے، نتیجہ جو کچھ بھی ہوا۔ اور یہ تحریک اس وقت جو کچھ کرنا چاہتی تھی، نہ کر سکی، لیکن اس کے اثرات فنا نہ ہو سکے۔ کسی کوشش کے ناکام ہو جانے سے وہ روح جو اس کوشش کا باعث ہوتی ہے بیکار تو نہیں ہو جاتی یہ روح اندر ہی اندر اپنا کام کرتی ہے، حالات سازگار نہیں ہوتے تو یہ روح ظاہر میں اپنے اصلی رنگ میں نہیں آتی۔ اس کے لئے کوششیں ہوتی رہتی ہیں، کبھی یہ کوئی شکل اختیار کرتی ہیں اور کبھی دوسری شکل۔ ان الگ الگ شکلوں سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ سب کوششیں الگ الگ تھیں اور ایک دوسرے سے بے تعلق۔ لیکن سمجھدار اس کثرت میں ایک ہی وحدت پاتے ہیں۔ مولانا عبیداللہ صاحب کا یہ کہنا کہ مسلمانوں کی موجودہ بیداری کی تحریک سرسید کے تعلیمی مشن اور محمد علی کی سیاسی جدوجہد سے شروع نہیں ہوئی، گو یہ بات انگریزی پڑھے ہوئے طبقوں کے لئے بہت حد تک ٹھیک ہے لیکن عام مسلمانوں کی بیداری کی تحریک کا سرچشمہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات، شاہ عبدالعزیز کے وعظ و ارشاد اور شاہ اسماعیل اور سید احمد شہید کے جہاد سے پھوٹتا ہے۔ بدقسمتی سے موجودہ

حکومت میں انگریزی پڑھے ہوئے طبقوں کو بڑا عروج حاصل ہے۔ انہی کی باتیں ہر جگہ سُنی جاتی ہیں، اخبار اور کالج اور سیاسی انجمنیں سب انھی کی ہیں یہ جو کچھ کہتے ہیں اس کا ہر جگہ چرچا ہو جاتا ہے۔ ان کے خلاف شاہ ولی اللہ کا نام لینے والے خود شاہ صاحب کے مقصود اعلےٰ سے ہٹ گئے ہیں۔ دوسرے زمانے کی زبان انگریزی اور اردو ہے، اور شاہ صاحب کی تعلیمات تمام کی تمام فارسی اور عربی میں ہیں۔ ضرورت تھی کہ شاہ صاحب کے ماننے والے ان کی باتیں اس زمانے کے رنگ میں پیش کرتے، لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ خود اپنی آنکھیں بند کئے دوسری دنیا میں رہتے ہیں۔ اور اس زمانے کی ان کو زیادہ خبر نہیں۔ یہ اسباب ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی سیاست، اجتماع اور اب تو مذہب کو بھی انگریزی پڑھے ہوئے طبقوں کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ بیشتر متوسط اونچے طبقوں کے لوگ ہیں۔ اور اگر ان میں سے پیدائشی طور پر کوئی نچلے طبقوں سے ہے بھی، تو اس کی زندگی کا بھی سارا مقصد یہ ہے کہ اس کا شمار اونچے طبقوں میں ہو سکے نتیجہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان کی جماعت کے کام مسلمانوں کے ذہنوں میں آنے نہیں پاتے۔ اور قیادت کی باگ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے، جو انگریزی عہد کی پیداوار ہیں۔ اور ان کا تمام تر سرمایۂ فکر دوسروں کا دیا ہوا ہے۔ مولینا مسلمانوں کی قومی جدوجہد کی تاریخ سرسید، مولینا محمد علی یا مسلم لیگ سے شروع کرنا غلط سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ سب کڑیاں شاہ ولی اللہ کی تحریک کے سلسلہ کی ہیں۔ اور یہ کہ قومی بیداری کی ابتدا ر سرسید یا مولینا

محمد علی سے ہوئی۔ ٹھیک نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کی تحریک مرہٹوں اور سکھوں کی طرح ایک خاص مذہبی فرقے کی تحریک نہ تھی؟ اگر گورو گوبند نے سکھوں کو ابھارا اور انہیں ایک قوم بنا کر مسلمان بادشاہوں سے جنگیں کیں! اور سیواجی اور پیشواؤں نے مرہٹوں کو منظم کر کے سارے ہندوستان پر اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کی۔ تو کیا اسی طرح شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں نے مسلمانوں کی فرقہ وارانہ تنظیم نہیں کی؟ اگر واقعہ یہی ہے تو مرہٹوں اور سکھوں کی طرح شاہ ولی اللہ کی بھی ایک تحریک ہے۔ جس کا کام صرف عام مسلمانوں کا اٹھانا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس خیال کو صحیح مان لیں تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف تو بدستور موجود رہا مانا کہ عام ہندوؤں اور مطلق العنان مسلمان بادشاہوں کے جھگڑے ہماری تاریخ کا اہم باب نہیں۔ لیکن اگر ہم اپنی قومی بیداری کی ابتدا شاہ ولی اللہ سے کرتے ہیں اور ہندو سیواجی اور گورو گوبند سنگھ کو اپنے قومی "ہیروز" شمار کرتے ہیں تو آپس کی شکر رنجی تو برابر قائم رہی اور اس نقطۂ نظر سے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں مل جل کر رہنے اور سیاسی کام کرنے کی کوئی صورت نہ نکلی۔

بظاہر اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ تاریخ کے واقعات کچھ اس طرح بیان کئے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کا نام لینے والی جماعت ایک متعصب تنگ خیال اور جنگجو مذہبی گروہ نظر آتا ہے۔ لیکن اگر اس مسئلہ کی پوری چھان بین کی جائے تو حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہندوستان کی حالت ناگفتہ بہ تھی، ملک چھوٹی

چھوٹی راجدھانیوں میں بٹ گیا تھا اور ان میں برابر جنگیں ہوتی رہتی تھیں اس خانہ جنگی کی وجہ سے ملک میں کوئی مرکزی حکومت بننے نہ پاتی تھی اور اس بنا پر باہر کی دنیا میں بھی اس ملک کی کوئی ساکھ نہ تھی۔ مسلمان بادشاہوں نے ان دونوں باتوں کا تدارک کیا اور آخر کار اکبر اعظم کے عہد حکومت میں مسلمان بادشاہوں کی برسوں کی کوششیں کمال کو پہنچیں۔ اور کابل سے لے کر دکن تک ہندوستان کی ساری قلمرو ایک بادشاہ، ایک قانون اور ایک سیاسی نظام کے ماتحت متحد ہو گئی اور ایشیا کے ملکوں میں ہندوستان کا نام عزت سے لیا جانے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب کے بعد دہلی کی مرکزی حکومت کمزور ہو گئی اور سلطنت کے حصے بکھرے ہوتے چلے گئے۔ اور مرکزی حکومت کا ضعف رکتا نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں، نوابان اودھ اور روہیلوں کی بغاوتیں اس کا لازمی نتیجہ تھیں۔ لیکن ہماری تاریخ کا یہ قدم ترقی کی طرف نہیں اٹھا تھا۔ بلکہ کم و بیش چھ سو برس کی مسلمان بادشاہوں کی جدوجہد کا جو حاصل تھا۔ وہ اس افراتفری میں ختم ہو رہا تھا، یعنی ہندوستان کی مرکزیت ان تحریکوں کی وجہ سے فنا ہو رہی تھی۔ شاہ ولی اللہ نے لامرکزیت کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے ایک نیا دستور حیات پیش کیا۔

شاہ صاحب اکبر اعظم کے ہندوستان کے بہت حد تک قائل نظر آتے ہیں، ایسا ہندوستان جس کا ایک قانون تھا۔ اس قانون کی نظر میں سارے ہندوستانی برابر تھے۔ نہ ہندو اس کے نزدیک کمتر تھے اور نہ مسلمان برتر۔ انصاف اس قانون کا اصل اصول تھا اور مذہبی رواداری

اس کا امتیاز خاص - بادشاہ سب کا بادشاہ تھا کُل ہندوستان کا بادشاہ۔ وہ محض مغلوں کا بادشاہ نہ تھا، اور نہ وہ صرف مسلمانوں کا بادشاہ تھا بلکہ وہ کُل ہندوستان میں بسنے والی مخلوق کا فرمانروا تھا۔ شاہ ولی اللہ عقیدہ وحدت الوجود کو مانتے تھے اور کثرت میں وحدت پر ان کا ایمان تھا۔ اس لئے وہ ایسے ہندوستان کا تصوّر کر سکے جو آزاد، خود مختار وحدتوں میں منقسم ہو اور بالجملہ ایک ہو، شاہ صاحب کا یہ فکر اتنا ہمہ گیر ہے کہ وہ صرف ہندوستان کی نہیں بلکہ ساری کائنات کی نہایت معقول اور فائدہ بخش تفسیر کرتا ہے، ان کی تصنیفات جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھی گئیں سب اسی نظام کی شرح کرتی ہیں۔

اس بیان سے کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ شاہ صاحب اکبر اعظم کے سامراج کو دوبارہ زندہ کرنے کی فکر میں تھے، اس سامراج کو تو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دم توڑتے دیکھا تھا۔ محمد شاہ کا دور، نادر شاہ کا حملہ، مرہٹوں کی شورشیں جاٹوں کی بغاوتیں، دہلی کی تباہی و بربادی، یہ سب ان کے سامنے کے واقعات تھے۔ شاہ صاحب نے خوب سمجھ لیا تھا کہ شہنشاہیت کا دور ختم ہو چکا، اب اگر کوئی حکومت بنے گی تو اس کا اساس کوئی اور ہو گا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے جس تحریک کی داغ بیل ڈالی وہ ہمہ گیر تحریک تھی۔ اُن کے پیش نظر پورا ہندوستان تھا، چونکہ مرکزی ہندوستان کی قیادت اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی، اس لئے لامحالہ شاہ صاحب نے عام مسلمانوں سے خطاب کیا لیکن شاہ صاحب کی دعوت کے اصول عام انسانیت کے اصول

تھے، اُن کا زور مذہب کی رسوم پر نہیں، بلکہ مذہب کی روح پر تھا۔ قانون کی ظاہری شکل پر نہیں، بلکہ قانون کی جان یعنی عدل و انصاف پر تھا، چنانچہ وہ تمام مذاہب کی اصل یہ چار اصول بتاتے ہیں :- اوّل خدا پرستی دوسرے عدل و انصاف، تیسرے صحت وصفائی اور چوتھے تربیت نفس۔ اُن کے نزدیک ہر مذہب کا فرض یہ ہے کہ ان چار مقاصد تک انسانوں کی رہنمائی کرے۔ گو مذاہب کے طریقے الگ الگ ہیں۔ لیکن ہر مذہب کی کوشش یہ ہونی چاہئیے کہ وہ خدا تک پہنچنے کی راہ لوگوں کو دکھائے۔ اور نیکو کاروں کی پہچان ان کی خدا پرستی ہے نہ کہ رسوم پرستی۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب نے معاشی عدم مساوات کی بھی بڑی خرابیاں گنائی ہیں، اور شہنشاہیت اور اس سے پیدا ہونے والے مفاسد کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جس سوسائٹی میں اقتصادی توازن نہ ہو، اُس میں طرح طرح کے روگ پیدا ہو جاتے ہیں، نہ وہاں عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے اور نہ مذہب اپنا اچھا اثر ڈال سکتا ہے۔ شاہ صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قیصر دکسریٰ نے متمدن دنیا کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا تھا، اور قدرتِ الٰہی مجبور ہوئی تھی کہ اسلام کے ذریعہ اس روگی نظام کو ختم کر دے۔ اسی طرح آج کی حکمراں سوسائٹی بھی ان اجتماعی بیماریوں سے کھوکھلی ہو چکی ہے اور ظاہر ہے اس کا مٹنا بھی اب یقینی نظر آتا ہے۔" الغرض مرہٹوں، جاٹوں سکھوں اور اُس عہد کی دوسری چھوٹی تحریکیں اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک

ہوں گی. لیکن ان میں سے کسی تحریک میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزیت اور وحدت کو بحال رکھ سکنے کی تدبیر سوچتی۔ شاہ صاحب اپنے مجوزہ نظام میں اکبر، جہاں گیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانے کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے. لیکن اس طرح سے کہ مطلق العنان بادشاہوں کی بجائے انصاف کی حکومت ہو اور یہ انصاف کرنے والا خواہ ایک امیر ہو یا کئی ایک یا پوری قوم، یعنی آجکل کی اصطلاح میں جمہوری حکومت، یہ خلاصہ ہے، شاہ صاحب کے سیاسی فکر کا، اور ہماری رائے میں یہ فکر آج بھی متحدہ ہندوستان کا اساس بن سکتا ہے۔

اب اگر کہا جائے کہ اگر شاہ ولی اللہ کے فکر کا دامن اتنا وسیع تھا اور ان کے اجتماعی اور سیاسی نظام میں سارے انسانوں کو بلا تفریق مذہب و ملّت ایک سے سلوک کا مستحق سمجھا جا سکتا تھا تو پھر شاہ ولی اللہ کی تحریک نے فرقہ وارانہ حیثیت کیوں اختیار کی۔ بات یہ ہے کہ پنجاب میں سکھوں نے صرف مغلیہ حکومت سے جنگ شروع نہیں کی تھی، بلکہ وہ کل مسلمانوں کے خلاف ہو گئے تھے۔ اس طرح مرہٹوں نے بادشاہی نظام کے اہل کاروں کو قتل نہ کیا بلکہ عام مسلمان ان کے مظالم کا نشانہ بنے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا. کہ وہ خود اپنی حفاظت کرتے۔ قوموں اور جماعتوں کی زندگی میں یہ منزل ایسی نازک ہوتی ہے کہ حضرت عیسےٰ ایسے صلح کل اور سر تا پا مجسم محبت پیغمبر بھی اپنے حواریوں کو تلوار سنبھالنے کا مشورہ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں حضرت

شاہ ولی اللہ کی جماعت کا مرہٹوں اور سکھوں کے خلاف معرکہ آرا ہونا نتیجہ تھا ان خاص حالات کا جن سے اس وقت مسلمانوں کو پالا پڑا۔ جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے، شاہ ولی اللہ کی جماعت مغلوں کے تخت و تاج کے لئے نہیں لڑی تھی، وہ تو ان عام انسانی اصولوں کو جن پر ان کے نظام کی بنیاد تھی زندہ کرنا چاہتے تھے۔ یہی وہ اصول تھے جن کے ذریعے ہمارے خیال میں ہندوستان نیا جنم لے سکتا تھا۔ بہرحال اب تو انگریزی تسلّط نے نہ سکھوں کو چھوڑا، اور نہ مرہٹوں کا راج رہا، زمانہ بدل گیا اور زمانے کے ساتھ ہندوستان کے حالات بھی بدل گئے۔ جب دشمنیوں کے اسباب نہ رہے تو اب پرانی دشمنیاں بھی بے معنی ہیں۔ ضرورت ہے کہ دہلی کے اس خدا پرست فلسفی صوفی کے افکار کو از سرِ نو پڑھا جائے اور ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر میں اس سے ہدایت حاصل کی جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان کے جھگڑوں کا حل شاہ صاحب کے مجوزہ نظامِ فکر سے ہو سکتا ہے۔

حزب ولی اللہ کا پہلا دور

حکیم الہند امام ولی اللہ

۱۱۳۱ھ تا ۱۱۷۶ھ

جس سال اورنگ زیب عالمگیر کے تخت پر سلطان محمدشاہ[1] متمکن ہوا، اسی سال دہلی کے مرتاض صوفی اور عالم مولینا عبدالرحیم بن وجیہ الدین العمری (متوفی ۱۱۳۱ھ) کے مدرسہ میں حکیم الہند امام ولی اللہ دہلوی اپنے باپ کی مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہ ۱۷۱۹ء ۱۱۳۱ھ کا واقعہ ہے۔

امام ولی اللہ کی ولادت بروز چہارشنبہ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ اور وفات ۱۱۷۶ھ میں ہوئی۔ اور سلطان مجدد عالمگیر کی وفات بروز جمعہ ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ میں ہوئی، اس حساب سے شاہ صاحب کی ولادت سلطان مجدد کی وفات سے چار سال پہلے ہوئی، اور شاہ عالم ثانی نابینا مکحول بادشاہ کے عہد میں آپ کا انتقال ہوا۔ چنانچہ شاہ صاحب کو

---

[1] امام ولی اللہ اور محمد شاہ کی ولادت کا سال ایک ہے، صرف مہینے کا فرق ہے۔ شاہ صاحب کی ولادت ماہ شوال میں ہے اور سلطان غالباً ماہ ذیقعدہ میں پیدا ہوئے، تاریخ ہند از ذکاء اللہ۔

دس سلاطینِ دہلی کی حکومت کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ عالمگیر اعظم۔ بہادر شاہ اوّل ۔ معز الدین جہاندار شاہ ۔ فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ محمد شاہ، احمد شاہ ۔ عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی ۔ آخر الذکر نابینا سلطان کے عہد میں شاہ صاحب کی وفات سے تقریباً دو سال بعد کلائیو نے الہ آباد کے مقام پر بنگالہ اور بہار اوڑیسہ کی دیوانی بادشاہ سے لے کر کمپنی بہادر کے حوالہ کی۔

تاریخ ہند کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ مذکورہ بالا سلاطین کے عہد میں ہندوستان کو کن کن لرزہ خیز واقعات وحوادث سے گزرنا پڑا۔ سادات بارہ کا تسلط۔ فرخ سیر کا ان کے ہاتھوں بصد بیکسی قید میں مرنا، پھر تورانی امراء کے ہاتھوں سادات بارہ کا زوال، مرہٹوں کی بغاوت اور ان کا عروج، سکھوں کی بغاوت، نادر شاہ کی یلغار اور دہلی میں قتل عام، احمد شاہ ابدالی اور معرکۂ پانی پت میں حق کا باطل پر غلبہ، سیاستِ ہند میں روہیلوں کی شرکت ومساہمت، ایرانی وتورانی امراء کی رقیبانہ چپقلش، ہندوستان میں یورپین اقوام کی للچائی ہوئی نگاہیں، پھر انگریزوں کا بنگال وبہار وغیرہ میں عمل ودخل۔ اور اس قسم کے دوسرے انقلابات شاہ صاحب نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

دہلی کی سلطنت جس اضطراب سے گزر رہی تھی، شاہ صاحب اس کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ حجاز تشریف لے گئے تو سلطنت عثمانیہ اور دوسری اسلامی حکومتوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ چنانچہ ایک خط

میں لکھتے ہیں "احوالِ ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد منشا رفقیر است۔ بلاد عرب نیز دیدیم۔ و احوال مردم ولایت از ثقاتِ آنجا شنیدیم"۔ ظاہر ہے ان واقعات و حوادث سے ان کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔

شاہ صاحب اپنے زمانۂ طالب علمی کا ذکر فرماتے ہوئے اپنی کتاب "جزو لطیف" میں لکھتے ہیں "جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو فقیر مکتب میں داخل ہوا۔ ساتویں برس والد بزرگوار نے نماز پڑھوائی اور روزہ رکھنے کی تلقین فرمائی، اور اس سال ختنہ کی رسم بھی ادا ہوئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اسی سال کے آخر میں میں نے قرآن عظیم ختم کیا، دس سال کی عمر میں شرح ملا جامی پڑھی۔ اور عام مطالعہ کی راہ میرے لئے کھل گئی۔ چودھویں برس میری شادی کر دی گئی، اور اس معاملہ میں والد بزرگوار نے بڑی عجلت سے کام لیا۔ پندرہ سال کا تھا کہ میں نے اپنے والد کے دستِ مبارک پر بیعت کی، اور تصوف کے اشغال میں لگ گیا۔ اور اس میں خاص طور پر نقشبندی مشائخ کے طریق کو اپنا مقصود بنایا۔ اِسی سال تفسیر بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا، اس سال والد بزرگوار نے وسیع پیمانے پر کھانے کا انتظام کیا اور خواص و عوام کو دعوت دی۔ اور اس موقعہ پر مجھے درس دینے کی اجازت دی گئی۔ الغرض اپنی عمر کے پندرھویں سال اپنے ملک کے دستور کے مطابق جو ضروری علوم و فنون تھے میں ان سے فارغ ہو گیا۔ سترہ سال کا تھا کہ حضرت والد رحمت حق سے جا ملاقی ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد فقیر بارہ سال

تک دینی اور علوم عقلیہ کی کتابیں پڑھاتا رہا۔ اور ہر علم میں فکر و غور جاری رکھا۔"

الغرض حکیم الہند نے اس طرح بارہ برس پڑھانے میں صرف کئے۔ آپ نے جو علوم و معارف اپنے والد اور ان کے رفقاء سے سیکھے تھے، اُن میں سے قرآن عظیم کا ترجمہ، حکمت عملی اور اشراق قلبی کے ذریعے علمی حقایق کا انکشاف، ان کی توجہ کا خاص مرکز بنے رہے۔ شاہ صاحبؒ "تفہیمات الٰہیہ" میں اپنے زمانے کی تین چیزوں کا خصوصیت سے ذکر کرتے ہیں۔ ایک برہان یعنی عقل، حکمت عملی اسی کا ایک شعبہ ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ مسلمانوں میں یونانی علوم فلسفہ و منطق کا رواج ہو چکا ہے۔ اور وہ علم کلام سے بڑی دلچسپی لیتے ہیں، دوسرا وجدان، اشراق یا کشف۔ اس زمانے میں لوگ شرفاً و غرباً صوفیہ کے علوم قبول کرنے پر متفق ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے اقوال اور حالات کتاب اور سنت کی نسبت لوگوں کے لئے زیادہ مرغوب خاطر ہیں، بلکہ عامتہ الناس تو کوئی چیز صوفیہ کے رموز و اشارات کے بغیر قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی اُن کے رموز و اشارات ماننے سے انکار کردے یا ان سے بے توجہی برتے تو کوئی شخص اُس کی بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اور نہ اُسے نیکو کاروں میں سے سمجھا جاتا ہے، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اسی بناء پر وجدان، اشراق قلبی یا کشف اس زمانہ میں ایک ضروری

موضوعِ علم بن گیا ہے۔ تیسری چیز ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول علوم۔ یعنی نقل۔ اور ان میں قرآن عظیم خاص طور پر قابل ذکر ہے، شاہ صاحب کا ارشاد ہے کہ ان تین امور کے ماسوا اس زمانہ میں "ہر شخص صرف اپنی رائے کو قابلِ اتباع سمجھنے کے روگ میں مبتلا ہو گیا ہے۔ حالت یہ ہو گئی ہے کہ کوئی شخص مشکلات کو حل کرنے کے لئے کسی سے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ہر کہ ومہ اپنی سمجھ کے مطابق احکام شرعیہ کے معانی اور اسرار پر بحث کر لیتا ہے۔ اور اپنی عقل کو اس تمام معاملہ میں اصل قرار دیتا ہے" اسی کے ساتھ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اہلِ عصر فقہ کے مختلف اصناف میں بھی اختلاف کر رہے ہیں، خصوصاً حنفی اور شافعی۔ اور ہر فرقہ اپنے اساتذہ کی پچ کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہر فقہی مذہب میں استخراجی مسائل کی کثرت ہو گئی ہے۔ اور حق کا پتہ لگانا مشکل ہو گیا ہے۔ طبعی طور پر حکیم الہند کو اپنی دعوت تجدید کے ضمن میں ان تین امور کی اصلاح کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی۔

قرآن عظیم کے ترجمہ کے سلسلے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "اس فقیر پر بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ مجھے متعدد بار اپنے والد بزرگوار کے درسِ قرآن میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ قرآن کے معانی بڑے غور و تدبر کے ساتھ بیان فرماتے، آیات کی شان نزول کی وضاحت کرتے۔ اور حل طلب امور کے لئے تفسیروں کی طرف رجوع کیا جاتا۔ اس کی وجہ سے میرے سامنے فتح و کامیابی کا ایک میدان کھل گیا۔ والد بزرگوار کا دستور یہ تھا کہ اپنے رفقاء کے حلقہ میں ہر روز تین رکوع سے کم مقدار میں قرآن

کی تلاوت کرتے اور اسی کے معانی پر غور و خوض فرماتے"۔ خود شاہ صاحب نے حج سے واپس آ کر پانچ سال کے بعد قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا[1] اور اس کے گیارہ سال بعد پہلی بار اس کی تعلیم شروع کی۔

حکمت عملی سے مراد یہاں مطلق حکمت عملی ہے۔ قرآن عظیم کی حکمت عملی، یہ شاہ صاحب کا اپنا استخراج ہے۔ شاہ صاحب سے بہت پہلے اکبر کے دور سے ہندوستانی اسلامی سوسائٹی میں حکمت عملی کی طرف خاص توجہ کی جانے لگی تھی۔ ابوالفضل نے اسی حکمت عملی کے اساس پر اکبری نظام کی بنا رکھی تھی۔ اور محمد شاہ کے عہد تک سلطنت کے کاروبار کا مرکزی فکر یہی رہا۔ شاہ صاحب اس حکمت عملی کو قرآن کے تعارف کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بات یہ تھی کہ بلاغت کے ذریعہ قرآن کا سمجھنا اور سمجھانا اس سوسائٹی کے لئے ممکن نہ رہا تھا۔ ہوتا یہ کہ بلاغت کے علوم پڑھتے پڑھتے ان لوگوں کی عمریں ختم ہو جاتیں اور قرآن کو ہاتھ لگانا انھیں نصیب نہ ہوتا۔ شاہ صاحب نے دیکھا کہ اُن کے زمانے کی اعلیٰ سوسائٹی حکمت علمی کو سمجھتی اور پہچانتی ہے اور اسی کو اپنا اساسِ زندگی مانتی ہے۔ چنانچہ آپ نے اسی کو قرآن کے تعارف کا ذریعہ بنایا اور اس عہد کی مروجہ او رمتداول حکمت علمی کو قرآن کے عملی تصورات کے تابع کیا اور اس طرح قرآن کی حکمت عملی کا اساسی فکر مسلمانوں کے سامنے پیش فرمایا۔

---

[1] مرزا حیرت دہلوی نے لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ نے قرآن کا ترجمہ کیا۔ اس سے دہلی میں اس قدر شورش برپا ہوئی کہ وہ حج پر جانے کے لئے مجبور ہو گئے۔ موصوف کا یہ بیان ٹھیک نہیں۔

بارہ برس تک شاہ صاحب اپنے گرد و پیش کی سوسائٹی کا مطالعہ کرتے رہے۔ اس زمانے کی دہلی میں اگر ایک طرف خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ تو اس کے ساتھ ہی گزشتہ عظمت کے بچے کھچے آثار بھی یقیناً ابھی موجود تھے، طبقۂ امراء میں آصف جاہ[1] جیسا فرزانہ مدبر اور سیاست دان جس نے آگے چل کر دکن میں اپنی مستقل حکومت کی بنیاد رکھی، اور طبقہ صوفیہ میں مرزا محمد مظہر جانجاناں[2] رح اس زمانہ کی یادگار ہیں، شہر میں مختلف کتب خانے اور باکمال اساتذہ تھے۔ الغرض اُس عہد کی دہلی میں ایک صاحب فکر کے لئے مطالعہ، تدبر اور سوچ بچار کے لئے ایک وسیع میدان موجود تھا۔

امام ولی اللہ نے اپنے اس بارہ برس کے مطالعہ میں اصلاحی پروگرام کے دو اصول معین کئے۔

(۱) قرآن عظیم کی حکمت عملی یعنی انسانوں کی عملی زندگی کے متعلق قرآنی تصورات ہی حقیقت میں ایک معجزہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اساس علمی اصلاح کے لئے تجویز ہوا۔

(۲) معاشرت، اجتماع، حکومت اور ملت میں تمام اخلاقی اور عملی خرابیوں کا باعث دراصل معاشی اور اقتصادی عدم توازن ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن عظیم کا معجزہ ہونا تو سب مسلمانوں کے لئے مسلّم ہے۔ لیکن ہر گروہ کا اعجازِ قرآن کے متعلق اپنا نظریہ ہے۔ فلسفی مزاج مدعیان اسلام نے بہت پہلے اُس اعجاز قرآن کو جو صرف عربی بلاغت سے وابستہ ہے چنداں اہمیت نہیں دی۔ اس پر اُن کے مخالفین کی طرف سے

---

[1] و [2] ضمیمہ جات میں تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

بہت کچھ لے دے بھی ہوئی۔ لیکن اگر ان فلسفی مزاج لوگوں کے اقوال کی یہ توجیہ کی جائے کہ عجمی اقوام چونکہ عربی بلاغت کے اعجاز کو کماحقہ سمجھنے سے قاصر تھیں۔ اس لئے اُن کے لئے قرآن کے اعجاز کا معیار عربی بلاغت نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ مجبور تھے کہ اعجاز کا معیار کسی دوسری چیز میں ڈھونڈیں۔ تو سارا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔ عبدالرحیم خیاط معتزلی عالم اپنی کتاب "الانتصار" میں لکھتا ہے کہ نظام یعنی ابراہیم بن سیّار کی رائے تھی کہ قرآن اپنے اسلوب بیان کی بنا پر اعجاز کی حیثیت نہیں رکھتا۔ لوگ اگر چاہئیں تو اس جیسا اسلوبِ بیان پیش کر سکتے ہیں۔ ابوالعلا معری نے تو اس باب میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ جس کا نام "الصرفۃ" ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ نے خود ہی قوائے بشریہ کو معارضۂ قرآن سے روکا ہوا ہے۔ ورنہ انسان ایسا قرآن بنا سکتے۔ معجم الادبا میں یاقوت حموی نے اس سلسلہ میں نقل کیا ہے کہ ابوالعلا معری کے نزدیک قرآن اپنی فصاحت میں اعجاز کا حکم نہ رکھتا تھا اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن اس شکل میں معجزہ تھا۔ کیونکہ یہ تو ہر فصیح و بلیغ کی قدرت میں ہے کہ وہ اس جیسا قرآن لا سکے، البتہ اللہ تعالےٰ نے انہیں اس سے روک دیا۔ چنانچہ اس طرح قرآن اپنی فصاحت کے اعتبار سے معجزہ بن گیا ہے۔ یاقوت لکھتا ہے کہ اہل کلام و شیعوں کی ایک جماعت بھی اس طرح کا عقیدہ رکھتی ہے جن میں بشر المریسی اور مرتضیٰ ابوالقاسم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

شاہ صاحب نے قرآن کے اعجاز کو اُس کے بتائے ہوئے نظامِ حیات میں متعین فرمایا۔ اس کی وجہ سے قرآن کی عملی افادیت ہی اس کا معجزہ ہونا بن

گیا - قرآن کے نظام حیات سے ہر شخص خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، عامی ہو یا عالم، فلسفی ہو یا سادہ مزاج مستفید ہو سکتا ہے۔ اور اس معاملہ میں اس کے اعجاز کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اگر قرآن کا اعجاز محض عربی فصاحت و بلاغت کا پابند ہو جاتا۔ تو معدودے چند افراد کے سوا دوسرے لوگ اس کی اعجازی خوبیوں سے محروم رہتے۔

قرآن کی حکمت عملی کے علاوہ شاہ صاحب کے اصلاحی پروگرام کا دوسرا اصول اقتصادیات میں توازن اور مساوات کی اہمیت بتانا تھا۔ عام طور پر تصوف فلسفۂ اخلاق سے شروع ہوتا ہے۔ گو حیوانی زندگی کے لئے اقتصادی ضروریات ضروری مانی جاتی ہیں۔ لیکن انسانیت کے ساتھ اقتصادیات کا جو تعلق ہے اس پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ اس کی وجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہو گئی۔ ہمارے بڑے عقل مند اور زیادہ با اخلاق صوفیا سب کے سب اجتماعی سیاست سے دور رہنا اپنا کمال سمجھتے رہے۔ اور یہی تصوف کی کتابوں کی سب سے بڑی کوتاہی تھی کہ ان کے مدون کرنے والوں نے انسانی اخلاق اور اقتصادیات کے باہمی رشتہ اور ایک کے دوسرے سے متاثر ہونے کی اہمیت کو نہ سمجھا۔ اس کے برعکس شاہ صاحب نے زندگی کی اس حقیقت کو اس کی صحیح شکل میں پہچانا۔ اور بار بار اپنی کتابوں میں اس کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۴۲ میں ارشاد ہوتا ہے "اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری رہے تو اس کی صنعت و حرفت اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر حکمران جماعت، آرام و آسائش اور زینت و تفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنائے تو اس کا بوجھ قوم کے

کاریگر طبقات پر اتنا بڑھ جائے گا کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گا۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اسوقت برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔ اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح صرف روٹی کمانے کے لئے کام کریں گے۔ جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ انسانیت کو اس سے نجات دلانے کے لئے کوئی راستہ ضرور الہام کرتا ہے یعنی ضروری ہے کہ قدرت الہیہ انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے اس ناجائز حکومت کا بوجھ اُتار دے۔ چنانچہ کسریٰ و قیصر کی حکومت نے یہی وتیرہ (آرام و آسائش۔ رفاہیت بالغہ) اختیار کر رکھا تھا۔ اس مرض کے ازالے کے لئے اُمیّین (عربوں) میں رسول اللہ صلی اللہ کو پیدا کیا گیا۔ فرعون کی ہلاکت اور قیصر و کسریٰ کی تباہی اس اصول پر لوازمِ نبوت سے شمار ہوتی ہے۔"

یہاں ضمنی طور پر مثالوں کے ذیل میں کہ دہلی کے بادشاہوں اور امیروں کی حالت بھی کسریٰ و قیصر کے لگ بھگ جا پہنچی ہے، فرماتے ہیں وما نراہ من ملوک بلادک یغنیک عن حکایاتھم۔ دوسرے موقع پر جہاں ربوا (سود) سے بحث کی ہے کہ اسلام نے ربوا کو قطعی طور پر بند کر دیا ہے۔ وہاں تفصیل سے بتایا ہے کہ "رفاہیت بالغہ" کے مرض سے سوسائٹی کو محفوظ کر دینا ضروری ہے۔

الغرض انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے اقتصادی توازن ایک ضروری امر ہے۔ ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہو۔ جب لوگوں کو اپنی اقتصادی ضرورتوں

سے اطمینان نصیب ہوتا ہے، تو پھر کہیں وہ اپنے خالی وقت میں جو ان کے پاس کسب معاش کے بعد بچ رہتا ہے۔ زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں۔ لیکن اگر اُن کی اقتصادی ضروریات ہی فراہم نہ ہوں اور حیوانی زندگی ان کی وجہ سے ٹھٹھر کر رہ جائے تو انسانیت کے اعلیٰ مقامات کا کسے ہوش رہے گا۔ چنانچہ اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس زندگی میں انسانی اجتماع کے اخلاق تکمیل پذیر ہو سکیں گے۔ اور جب انسان کے اخلاق اس دنیا میں سدھر گئے اور تہذیب نفس کے ذریعے اس نے اپنے اخلاق کی تکمیل کر لی تو لازمی طور پر موت کے بعد دوسری زندگی میں بھی اس کے لئے قبر اور حشر کی مصیبتیں آسان ہو جائیں گی۔ اور اخلاق کی یہ تکمیل ہی اُسے جنت کا حق دار بنائے گی - اور اسی کی آخری ارتقائی منزل یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی رؤیت سے بہرہ ور ہو۔ اگر انسانی اجتماع کو ترقی کی اس راہ پر چلانا نبوت کا اصل مقصد سمجھ لیا جائے تو نبوت انسانی زندگی کے لئے ایک فطری[1] چیز بن جاتی ہے۔ اور نیز جہاں نبوت نہ ہو وہاں انبیاء کے اتباع یعنی صدیق اور حکیم یہ کام کریں۔ تو اس طرح انسانیت کا مجموعی مسئلہ حل ہو جاتا ہے، شاہ صاحب کے نزدیک اقتصادی توازن کے یہ معنی ہیں

قرآنی حکمت عملی، اور اقتصادی توازن، یہ دو اصول تھے

---

[1] انسان کی پوری زندگی کی تہذیب اور اصلاح نبوت کا اولین مقصد ہے۔ ابن خلدون کا یہ نظریہ کہ "انسان کو صرف اُمور آخرت معلوم کرنے کے لئے نبوت کی ضرورت پڑتی ہے، اور دنیا وی معیشت کا نظام محتاج نبوت نہیں" نادرست ہے۔ (مجلہ الفرقان میں مولینا کا مضمون اسرار

شاہ صاحب کے مجوزہ اصلاحی پروگرام کے۔ اور مختصر الفاظ میں یہ مراد تھی ان دو اصولوں سے شاہ صاحب اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد پورے بارہ برس تک ان امور پر برابر غور و خوض کرتے رہے اور دہلی میں رہتے ہوئے ان مسائل کے متعلق بحث و نظر کے جو امکانات تھے اُن سے مستفید ہوئے۔ حکیم الہند اپنے اس لائحہ عمل کو ایک مدلل شکل میں اپنی قوم کے ارباب فکر کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کیلئے جس قدر علم حدیث کی ضرورت تھی، اس کی تحصیل دہلی میں ممکن نہ تھی۔ چنانچہ اس غرض کے لئے آپ حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں کامل اساتذہ کی صحبت اور اعلیٰ علمی کتابوں کے مطالعہ سے دو سال کے عرصہ میں آپ نے حدیث و فقہ میں مجتہدانہ کمال پیدا کر لیا جو دعوت تجدید کے لئے ایک ضروری امر تھا۔

اپنے اس سفر حجاز کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس طرح بارہ سال گزرنے پر میرے دل میں حرمین پاک کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ ۱۱۴۳ھ میں فقیر حج سے مشرف ہوا، اور ۱۱۴۴ھ کا سال مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے قیام میں گزرا۔ یہاں شیخ ابو طاہر قدس سرہٗ اور حرمین پاک میں دوسرے مشائخ سے حدیث پڑھی، اور اسی زمانہ میں فقیر نے مدینہ منورہ کا سفر کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مطہرہ سے بے شمار فیوض پائے۔ دوران قیام حجاز میں حرمین پاک کے باشندوں اور وہاں کے علماء وغیرہ سے بڑی دلچسپ صحبتیں رہیں۔ شیخ ابو طاہر نے اپنے طریقت کے خرقہ سے جو تصوف کے سب طریقوں پر جامع اور مشتمل تھا۔ مجھے نوازا۔ اس سال کے آخر میں دوبارہ حج کیا اور ۱۱۴۵ھ

؎ تفصیل ضمیمہ جات میں ہے۔

میں وطن کی طرف لوٹا اور رجب کی چودھویں تاریخ جمعہ کے دن خیر و عافیت کے ساتھ گھر پہنچا[1]۔

منصب تجدید کے لئے ضروری تھا کہ علوم حدیث و فقہ میں اجتہاد پیدا کیا جاتا۔ چنانچہ حرمین پاک کے زمانۂ قیام میں شاہ صاحب نے اجتہاد میں کمال حاصل کرلیا۔ اس کے ساتھ ان کی قوت اشراق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے بھی استفادہ کیا۔ اپنی "کتاب" "فیوض الحرمین" میں انہوں نے اُن تمام فلسفی، سیاسی، اجتماعی فوائد کا ذکر کیا ہے جو انہیں اس طرح حاصل ہوئے۔

برسوں کے مطالعہ، مشاہدہ، غور و فکر اور پھر خاص طور پر ان فیوض حرمین کے بعد شاہ صاحب کی ذات انقلابی قوت عمل کو اپنے اندر پورے کمال پر پیدا اور متحرک پاتی ہے۔ اور جو کچھ انھیں مستقبل میں پیش آنے والا ہے وہ اُسے خواب میں دیکھتے ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب نے جمعہ کی رات ۲۱ ذیقعدہ ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) کو مکہ معظمہ میں ایک الہامی خواب دیکھا، اس کا حاصل ہم اپنی زبان میں تحریر کرتے ہیں۔

(۱) انھیں یقین دلایا گیا کہ ان کے ذریعہ موجودہ مفاسد کا تدارک ہوگا یعنی وہ ان خرابیوں کو دور کرنے میں ایک مستقل ذمہ دار حیثیت کے مالک ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی انقلابی تعلیمات ایک مستقل حکومت[2] کا باعث

---

[1] جزو لطیف،

[2] جس طرح فقہ میں بعض مجتہد منتسب کا درجہ رکھتے ہیں۔ یعنی وہ مستقل مجتہد کے تابع ہوتے ہیں، اس طرح بعض حکومتیں بھی پہلے خاندان شاہی کے تابع ہوکر منتسب کا درجہ حاصل کرلیتی ہیں اس کے بالمقابل مجتہد مستقل کی طرح اصل انسانیت پر غور کرکے نئے اصول و ضوابط پر ایک حکومت پیدا ہوتی ہے۔ اُس کو حقیقی مستقل حکومت کہنا چاہیے، شاہ صاحب کی علمی دعوت در اصل اس امر کی مقتضی تھی کہ ایسی حکومت پیدا کی جائے جس کو خلافت راشدہ کے سوا کسی اور سے انتساب نہ ہو۔

اور موجب بنے گی۔

(۲) اُنھیں بتایا گیا کہ پہلا نظام توڑ کر اس کے عوض وہ نیا نظام قائم کرنے کا ذریعہ بنیں گے۔ یعنی وہ ہندوستانی مسلمانوں کے تمام دینی علوم اور سیاسی اور اجتماعی تحریکات میں مستقل امام ہوں گے۔

(۳) اُنھیں سمجھایا گیا کہ ان کی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے باہمی لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ پیش آنے والا ہے۔

مختصراً اس سارے خواب کا حاصل یہ نکلا کہ حکیم الہند اسلامی ہندوستان میں ایک مکمل اجتماعی انقلاب کے شروع کرنے والے ہوں گے۔

اس عزم کے ساتھ شاہ صاحب دہلی واپس آئے اور سب سے پہلے آپ نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ "فتح الرحمان"[1] مکمل کیا۔ جس میں اجمالی طور پر اپنے پروگرام

---

[1] قرآن کریم کا فارسی ترجمہ ہندوستان میں سب سے پہلے ملک العلماء شہاب الدین ہندی دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ نے اپنی تفسیر بحر مواج میں لکھا ہے (آپ کے حالات ابجد العلوم صفحہ ۸۹۳ میں ملیں گے) بحر مواج میں وہ ہر ایک فن کے متعلق قرآنی تحقیق علیحدہ علیحدہ عنوانوں سے لکھتے ہیں مثلاً سب سے پہلے ایک آیت نقل کرتے ہیں اور اس کے نیچے "الترجمہ" لکھ کر اس کا فارسی میں ترجمہ کر دیتے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں "الاعراب" پھر "البلاغت" پھر "شانِ نزول" وغیرہ ساری کتاب اسی طرح مرتب کی ہے، چنانچہ اس میں ترجمۂ قرآن کی ایک مستقل اور مکمل حیثیت ہے۔ اس کتاب کی پہلی جلد طبع ہو چکی ہے۔ ملک العلماء کے حاشیۂ کافیہ اور میر سید شریف کے ترجمہ فارسی کو دیکھ کر مولانا جامی نے ایک جدت پیدا کی۔ اور شرح ملا جامی لکھی۔ ملک العلماء کی شرح کافیہ کا نہایت خوشخط نسخہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ الغرض قرآن عظیم کا پہلا فارسی ترجمہ شیر شاہ سوری کے استاد نے کیا، ان کا مطمح نظر قرآنی بلاغت کا اعجاز تھا۔ دوسرا ترجمہ امام ولی اللہ دہلوی کا ہے جن کا نصب العین قرآنی حکمت کا اعجاز ثابت کرنا تھا۔

کو درج کر دیا۔ اور ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں اس کی تدریس بھی شروع کر دی۔
شاہ صاحب کے اجمالی پروگرام کو سمجھنے کے لئے ان کے ترجمۂ قرآن کے حواشی سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ شاہ صاحب نے فتح الرحمٰن کے حواشی میں وہ تمام چیزیں درج کر دی ہیں، جو ان کی دعوت تجدید میں اساس کا حکم رکھتی تھیں سب سے پہلی بات جس کی طرف شاہ صاحب نے توجہ دلائی وہ یہ ہے کہ اسلام کی حکومت مکہ ہی میں پیدا ہو گئی تھی۔ اور یہ اپنی جگہ مستقل حکومت تھی، گو اس زمانہ میں ابھی تشدد اور لڑائی کی اجازت نہ ملی تھی۔ سورۂ "رعد" کے آخری فائدے میں اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۔ کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اسلام کی شوکت روز بروز عرب کی سرزمین میں ترقی کر رہی تھی۔ اور دار الحرب کا دائرۂ اثر بتدریج کم ہو رہا تھا۔ گو عام مفسرین نے اس آیت کو مدنی قرار دیا ہے۔ لیکن مترجم کے نزدیک اس کا مدنی ہونا ضروری نہیں۔ دار الحرب کے دائرۂ اثر کے کم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ عرب کے مختلف قبائل مثلاً اسلم غفار، جہینہ، مزینہ اور بعض یمنی قبائل مسلمان ہو رہے تھے۔ یہ واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے۔" الغرض شاہ صاحب کے نزدیک مکہ میں اسلام کی حکومت بن چکی تھی گو اصولاً یہ عدم تشدد پر عامل تھی۔

شاہ صاحب نے اسی نظام مکی کی تقلید میں اپنی انقلابی تحریک کو چلایا۔ چنانچہ انہوں نے تصوف کے خاص طریقہ کی بیعت کو اپنے سیاسی نظام کا اساس بنایا۔ دوسرے لفظوں میں طریقت کی بیعت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ بیعت کرنے

والے نے جماعت کا سیاسی نظام تسلیم کر لیا ہے یہی وجہ ہے کہ انکی سیاست میں تصوف کو اتنا بلند دینی درجہ دیا گیا۔ بات یہ ہے کہ جب تک حکومت کو چلانے کی استعداد پیدا نہ ہو کوئی شخص لڑ کر نیا نظام حکومت قائم نہیں کر سکتا۔ بیشک وہ لڑائی کے ذریعہ پچھلی حکومت کو تباہ تو کر سکتا ہے، لیکن جبتک تربیت یافتہ آدمی اُسے میسر نہ آئیں وہ نئی حکومت چلا نہیں سکتا۔ اور اس قسم کی تربیت اور استعداد صرف عدم تشدد کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہر نئی تحریک کو شروع میں اپنا پیغام دوسروں کو سنانے اور اُن کو اپنے ساتھ ملانے کیلئے عدم تشدد پر لامحالہ عمل کرنا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب نے اسی اصول پر اپنی جماعت تیار کرنا شروع کی۔ چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ انکے بعد اُن کے جانشین شاہ عبدالعزیز نے نظام حکومت چلانے کے لئے آدمی بھی تیار کر دیئے۔

بیشک اس زمانے میں ایسے باخبر لوگ موجود تھے جنہیں اس انقلابی تحریک کا احساس ہوا۔ انہوں نے عوام میں شورش پھیلا کر مسجد فتح پوری سے نکلتے وقت حکیم الہند پر حملہ کرا دیا۔

لہ "شاہ ولی اللہ پہلے بزرگ ہیں۔ جنہوں نے گیارہ سو برس کے بعد سرزمینِ ہندوستان میں قرآن کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ لیکن جب اس کی اشاعت ہوئی تو تھلکہ مچ گیا۔ کٹ ملانوں نے سمجھ لیا کہ ہماری روزی کی عمارت ڈھا دی گئی۔ اب جہلا کبھی قابو میں نہیں آئیں گے۔ اور ہر بات پر بحث کرنے کو تیار ہو جایا کرینگے۔ علاوہ کفر کے فتوی دینے کے شاہ صاحب کے جانی دشمن ہو گئے اور قتل پر تل گئے، ان کے اشارے پر چند بدمعاش شاہ صاحب کی تاک میں رہنے لگے، اس سازش کا آپ کو وہم و گمان بھی نہ تھا، ایک روز شاہ صاحب عصر کی نماز فتح پوری میں پڑھ رہے تھے۔ ابھی آپنے سلام پھیرا ہی تھا کہ دروازے پر شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آوارہ گردوں کی ایک جماعت حملہ آور ہونا چاہتی ہے، شاہ صاحب

(باقی صفحہ ۴۶ پر)

امام ولی اللہ نے اپنے اس فکر کی اشاعت اور تعلیم کی غرض سے بیسوں کتابیں لکھیں، وہ سب دہلی کی علمی زبان یعنی فارسی میں تھیں۔ ان کتابوں میں حکیم الہند نے اپنی دعوت کے اصول اور مسائل ضبط کر دیئے، لیکن اس معاملہ میں اتنا التزام فرمایا کہ ان امور کو ایک جگہ قلمبند نہ کیا بلکہ ان کو اپنی تصانیف میں

حاشیہ بقایا صفحہ ۴۵

کے ساتھ فقط چند خدام تھے، اور یہ جماعت بڑی تعداد میں تھی، شاہ صاحب نے چاہا کہ کھاری باؤلی والے دروازے سے نکل جائیں۔ مگر انہوں نے اس طرف آکر گھیر لیا۔ شاہ صاحب کے پاس ایک چھڑی تھی آپ نے حملہ آوروں سے دریافت کیا کہ آخر آپ لوگ میرے قتل کے درپے کیوں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ تو نے قرآن کا ترجمہ کر کے عوام کی نگاہ میں ہماری وقعت برباد کر دی، اگر یہی حالت رہی تو ہماری آئندہ نسلوں کو کوئی ذرہ برابر وقعت نہیں دے گا، آپ نے نہ صرف ہمیں برباد کیا ہے بلکہ ہماری اولاد کو بھی تباہ کر دیا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کی عام نعمت کو چند افراد یا ان کی اولاد کے لئے خاص کر دیا جائے؛ کچھ دیر رد و بدل رہی۔ قریب تھا کہ وہ کوئی بڑا اقدام کریں۔ کہ شاہ صاحب کے خدام نے تلواریں سونت لیں اور وہ اوباش نوجوان جو بلاوے کے ساتھ تھے۔ تلواریں دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے اور آپ سلامت گھر پہنچ گئے (حیات ولی صفحہ ۲۲۱)

واضح رہے کہ یہ طرز بیان مولف حیات ولی نے مرزا حیرت دہلوی سے لیا ہے۔ اس ادبی افسانہ طرازی کو چھوڑ کر اصل واقعہ کو حقیقی طور پر معلوم کرنے کی ضرورت ہے، عوام اور امام ولی اللہ میں کیا بات ہوئی۔ اور کس طرح تلواریں دکھا کر ان کو ڈرایا گیا۔ یہ سب سخن گسترانہ امور ہیں، اصل واقعہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ حکام کو یہ بات ناگوار گزری کہ عوام قرآن سے واقف ہوں۔ امیر الروایات میں ہے: "دہلی میں نجف علی خاں کا تسلط تھا۔ (سکے حالات کے لئے سیر المتاخرین اور تاریخ ذکار اللہ دہلوی ملاحظہ ہوں) جس نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتروا کر ہاتھ بیکار کر دیئے تھے۔ تاکہ وہ کوئی کتاب یا مضمون نہ تحریر کر سکیں، اور اسی نے مرزا مظہر جانجاناں کو شہید کروایا تھا اور شاہ عبدالعزیز و شاہ رفیع الدین کو اپنے قلمرو سے نکال دیا تھا" بحوالہ ش، م صفحہ ۲۷

اِدھر اُدھر پھیلا کر بیان کر دیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ نااہل لوگوں کی دست بُرد سے محفوظ رہیں۔

شاہ صاحب کے پروگرام کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لئے یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ امام ولی اللہ کی حیثیت امت محمدیہ میں ایک عظیم الشان صدیق اور حکیم کی ہے، اس طرزِ فکر کے ارباب کمال انبیاء کی طرح تمام[1] انسانیت کو اپنا مخاطب بناتے ہیں، گو بظاہر ان کی دعوت اپنی قوم کے لئے ہوتی ہے۔ امام ولی اللہ کی کتابیں غور سے پڑھی جائیں تو صاف نظر آئے گا کہ ان کی زبان اگرچہ دہلی کی زبان ہے۔ لیکن ان کے مخاطب دہلی کے اعلیٰ طبقہ کی توسط سے ایک طرف یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کی عربی و عجمی قومیں ہیں۔ تو دوسری طرف یونان اور ایران اور ہند کی صابئی (آرین) قومیں بھی مساوی درجہ پر خطاب میں شریک ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حکیم الہند کا روئے سخن دراصل تمام انسانیت کی طرف تھا، چنانچہ وہ اپنی کتاب "بدور بازغہ" میں ارتفاقات کے ذیل میں فرماتے

---

[1] شاہ ولی اللہ جب قرآن شریف کی تشریح کرتے ہیں، تو اس میں یونان اور ہند کو بھی سامنے رکھتے ہیں، ہمارے اہل علم کو یہ چیز گراں گزرتی ہے، وہ شاہ صاحب کو ایک مدرسہ اور ایک مسجد کا مجدد اور امام وغیرہ وغیرہ سب کچھ مانتے ہیں۔ لیکن یہ کہ وہ تمام انسانیت کی اصلاح کے داعی تھے، اُن پر شاق گزرتا ہے۔ ہم صلاحیت پسند بزرگوں کے ذہنی بُعد کو تو دور کر سکتے ہیں لیکن ہم ضدی طبیعتوں کو خطاب کرنا نہیں چاہتے۔ قرآن شریف نے "من تولّٰی و اَدبر" کو اپنے مخاطبین کی صف سے نکال دیا ہے، ہم بھی قرآن مجید کے اُس اصول پر عمل کرتے ہوئے امت محمدیہ کے اس حکیم کی دعوت کا مخاطب ضدی طبیعتوں کو نہیں بناتے۔

ہیں "ہم نے یہاں اِن ارتفاقات (اجتماعی اداروں) کے احکام اور ان سے متعلقہ علوم کے بیان میں بڑی تفصیل سے کام لیا ہے لیکن اس معاملہ میں دو باتیں ضرور پیش نظر رہنی چاہئیں، ایک تو یہ ہے کہ ہم ارتفاقات کی وضاحت کے سلسلہ میں عموماً ایک معیّن مثال کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس سے ہمارا مقصد صرف یہی مثال نہیں ہوتا بلکہ یہ، یا اس جیسی کوئی اور یا اس کے لگ بھگ کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارا اصل مقصود تو یہ ہے کہ وہ عمومی قواعد جن کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اُن پر یہ اجتماعی ادارے پورے اُتریں ظاہر ہے یہ ادارے ہر قوم اور ہر ملک میں ایک سے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہر قوم کی اپنی خاص عادتیں اور اپنے مخصوص علوم ہوتے ہیں۔ البتہ ضرورت صرف اس امر کی ہوتی ہے کہ یہ ادارے عمومی قواعد کے مطابق ہوں۔ خواہ ظاہری شکل و صورت میں یہ ایک دوسرے سے جدا جدا ہی ہوں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ انسان خود اپنی جبلّت اور طبیعت کے تقاضہ سے مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے ارتفاق (اجتماعی ادارے) کی تشکیل کرے۔ یہ پہلا درجہ ہے۔ دوسرے درجہ میں تجربی علوم اور صحیح اخلاق ظہور پذیر ہوتے ہیں"[1]۔

اس سے زیادہ تفصیل "بدور بازغہ" کے تیسرے مقالہ کے شروع میں ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "تمہیں جاننا چاہیئے کہ وہ تمام ارتفاقات (اجتماعی ادارے) جن پر انسانی نظام تمدن کی عمارت کھڑی ہے، اور وہ کُل کے کُل اقترابات (خدا تک پہنچنے کے وسائل) جو انسانوں کی فطرت میں ودیعت کئے گئے ہیں، مثلاً

---

[1] صفحہ ۵۱

احسان، عبادت، برائیوں سے اجتناب وغیرہ وغیرہ، یہ ایسے امور ہیں جو مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے قاعدے کلیئے تو ایک ہیں، لیکن ان کی صورتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ ان میں سے مثال کے طور پر ہم نکاح کو لیتے ہیں، جس نے نکاح کے معاملے میں صرف اعلان ڈھول بجانے اور رغنا پر اکتفا کیا، تو اس نے حق واجب ادا کردیا۔ اور اسی طرح جس نے نکاح کے لئے گواہ اور ایجاب وقبول کو ضروری ٹھہرایا اس نے بھی نکاح کا فرض پورا کردیا، کیونکہ نکاح کا اصل مقصود تو یہ ہے کہ ایک عورت کا اس طرح تعین کردیا جائے کہ اس میں ایک مرد کے سوا کوئی دوسرا دخیل نہ ہوسکے۔ اور اوپر کی ہر دو صورتوں میں حاصل مراد یہی ہے۔ یہی حال تقرب الی اللہ کا ہے، کبھی تو اس منزل تک انسان یوں پہنچتا ہے کہ وہ انسانی خواص کا جامہ اتار کر خدا کی ذات میں اپنے آپ کو گم کردے۔ اور تقرب الی اللہ کا ایک راستہ یہ ہے کہ اپنے اعضاء جوارح کی صحیح تربیت کی جائے اور انسانیت اور انسانی خواص کے دائرہ میں رہتے ہوئے اللہ سے تقرب چاہا جائے۔ اسی پر ان تمام بڑے بڑے مسائل کا قیاس کرو جو ارتفاقات اور اقترابات کے سلسلہ میں ہم نے بیان کئے ہیں کہ اُنکی شکلیں اور صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔

اس سے پہلے ملتِ حنیفی کے نقطۂ نظر سے ہم ارتفاقات اور اقترابات کی بہت سی شکلیں پیش کر آئے ہیں، تم کہیں اس کی وجہ سے غلط فہمی میں نہ پڑ جانا۔ ان کا ذکر محض مثال کے طور پر تھا۔ اس سے زیادہ اس ذکر سے ہمارا کوئی اور مقصد نہ تھا۔ اور پھر یہ بھی نہ سمجھ لینا کہ اصل حقیقت صرف ارتفاقات اور اقترابات کی اِن بیان کردہ شکلوں تک محدود ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک اِس

معاملہ میں اصل حقیقت کا تعلق ہے کوئی ملت یا مذہبی گروہ ایسا نہیں جو اصل حقیقت کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اور کوئی فرد ایسا نہ ہوگا جو انسان کے لقب کا اہل ہو اور وہ اس حقیقت کا اعتراف نہ کرے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ اس کے احکام کو بجا نہ لائے۔ جھگڑا اصل حقیقت کے معاملہ میں نہیں ہوتا۔ نزاع اور اختلافات اس حقیقت کو مختلف شکلوں میں پیش کرنے پر پیدا ہوتے ہیں[۱]"

ان نصوص سے صاف ظاہر ہے کہ امام ولی اللہ کی تصانیف میں جس قدر قواعد کلیہ مذکور ہیں، وہ دراصل ان کے فلسفہ کے اساسی اصول ہیں اور جس قدر شریعت کے مسائل بیان کئے گئے ہیں، وہ ان قواعد کی مثالیں ہیں۔ ان عمومی قواعد کو ان مثالوں میں منحصر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اس اساسِ فکر پر متدین اقوام کے عقل مند افراد ایک بین الاقوامی نقطہ وحدت پر جمع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ قرآن عظیم کے خصوصی قانون نے اسی بین الاقوامی سپرٹ کو صحیح اصول پر محفوظ کر دیا ہے۔

عام ذہنوں سے اس استبعاد کو دور کرنے کے لئے مولانا محمد اسماعیل شہید کی کتاب "العبقات" سے یہاں چند سطریں نقل کرنا ضروری ہیں۔ مولانا شہید مقربین کے وہبی کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے حکیم اور صدیق کے حق میں لکھتے ہیں "اس کو اگر تورات کے ماننے والوں کے درمیان مسندِ قضا پر بٹھا دیا جائے۔ تو وہ ان میں تورات کے مطابق فیصلے کر سکتا ہے، اور انجیل والوں میں انجیل کے مطابق۔ اور قرآن کے ماننے والوں میں قرآن کی رو سے فیصلے کرے گا۔ بات یہ ہے کہ ہر وہ مذہب جس پر عقلمندوں کی ایک بہت بڑی جماعت جمع ہوئی ہو، اور خاص طو

---

[۱] صفحہ ۱۸۰

پر ان میں ایسے لوگ ہوں جن کا غیب سے اتصال ہو۔ مثلاً عیسائی راہب، یہودی، یونانی فلسفۂ اشراق کے ماننے والے اور ایرانی جو نور وظلمت کو مانتے ہیں اور ہندوستان کے جوگی۔ ایسے مذہب کی حظیرۃ القدس میں اپنی مخصوص اور پائدار جگہ ہوتی ہے۔ اور اُس کی سوت اُسی سرچشمہ سے پھوٹتی ہے۔ لیکن بعد میں یوں ہوتا ہے کہ اس مذہب میں بُرے خیالات مل جاتے ہیں اور ادھر ادھر کی بیہودہ رسموں اور بے کار روائتوں کا اس میں عمل دخل ہونے لگتا ہے۔ تعبیریں اور تفسیریں غلط کی جاتی ہیں اور غیب سے جس رنگ میں علم کا فیضان ہوتا ہے۔ ذہن اس کو اصل کے مطابق اخذ نہیں کرتا۔ نیز بعد میں آنے والے اپنے گزرے ہوئے بزرگوں کی باتوں کو وہ معنی پہناتے ہیں، جو اُن کے پیش نظر نہ تھے۔ حکیم کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ان سب مذاہب اور آرار کی اصل کو اِدھر اُدھر کی تمام ملاوٹوں سے پاک حظیرۃ القدس میں نمایاں طور پر دیکھ لیتا ہے، کیونکہ اس کی روح بیدار ہوتی ہے"۔

یہ حکیم اور صدیق دعوت و تبلیغ میں اپنی قوم کی تخصیص محض اس لئے کرتے ہیں، تاکہ اپنی قوم کے تعلیمیافتہ حصّے کو دنیا کے سامنے عملی نمونہ بنا سکیں۔ اگر ان کی کتابیں زیادہ غور سے پڑھی جائیں تو یہ محسوس ہوگا کہ وہ اپنی قوم کے ہر فرد کو انسانیت عامہ کی تعلیم کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں ہندوستان میں دہلی ایک ایسا مرکز تھا جس میں اقوام عالم کے سب نمونے ملتے تھے اور ہر قسم کے فکری رجحانات وہاں موجود تھے۔ چنانچہ اُس عہد کی دہلی میں ذہنی طور پر یہ استعداد تھی کہ وہ ایک ایسی انسانیت پرور اور عالمگیر تعلیم کا ذریعہ بنتی جو اس کے توسط سے سارے ہند اور پھر ساری دنیا کو

دی جاتی۔

دہلی کی اس مرکزیت کا سنگ بنیاد اس وقت سے بہت پہلے سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں جو خواجہ بختیار المتوفی ٦٣٣ھ کے خلیفہ تھے رکھدیا گیا تھا۔ خواجہ ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۷ اور قاضی منہاج الدین ناصری صفحہ ۱۶٦ میں لکھتے ہیں "سلطان شمس الدین کے عہد میں چنگیز خاں کی تباہ کاریوں سے جان بچاکر بڑے بڑے سردار اور امیر جو سالہا سال سے اپنے اپنے ملکوں میں حکومتوں کے مالک چلے آتے تھے۔ اور نامی گرامی علماء اور وزراء سب کے سب دہلی میں جمع ہوگئے۔ ان جلیل القدر ارباب حکومت، وزراء اور اہل علم کی نظیر دنیا میں مشکل سے مل سکتی تھی۔ ان کے بدولت التمش کا دربار محمود غزنوی اور سلطان سنجر کے درباروں کا نقش ثانی بن گیا۔ ابتدائے سلطنت ہی سے بادشاہ کی یہ کوشش رہی کہ وہ دنیا بھر کے علماء سادات ملوک امراء اور عظام وکبار کو اپنے دار السلطنت میں جمع کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ ہر سال ایک کروڑ روپیہ صرف کرتا تھا، اس زمانہ میں دہلی میں ہر طرف مخلوق اُمڈ کر آگئی تھی۔ چنانچہ التمش کے فضل وکرم سے یہ شہر دنیا بھر کے بڑے آدمیوں کا مرجع بن گیا"

اس کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن متوفی ٦٨٦ھ کے عہد میں جسے بہترین زمانہ کہا جاتا ہے، ماوراء النہر، خراسان، عراق، آذربائیجان، فارس، روم وشام کے ملوک اور شہزادے چنگیزیوں کی دست برد اور ترکتاز سے بھاگ کر بلبن کے زیر سایہ دہلی میں باعزت زندگی بسر کرنے لگے تھے، ان

نوواردوں کے ناموں پر دہلی میں پندرہ محلے آباد ہوئے جنکے اسماء کی تفصیل تاریخ فرشتہ صفحہ ۵، میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ اکنافِ عالم میں سے ہر فن اور ہر علم کی بے نظیر اور یگانۂ دہر ہستیاں بلبنی بارگاہ میں جمع ہوگئیں، جن کی وجہ سے دانشمندوں نے بارگاہِ بلبنی کو بارگاہ محمود وسنجری پر ترجیح دی ہے۔

[1] سلطان علاء الدین خلجی اسکندر ہند متوفی ۷۱۶ھ کے عہد میں دہلی کا نقشہ امیر خسرو متوفی ۷۲۵ھ نے ان کبھی نہ بھولنے والے الفاظ میں یوں کھینچا ہے۔

خوشا ہندوستان و رونقِ دیں	شریعت را کمال عز و تمکین
زعلمِ باعمل دہلی بخارا	زشاہاں گشتہ اسلام آشکارا
مسلماناں بہ نعمانی، روش خاص	زدل ہر چار آئیں را بہ اخلاص
نہ کیں با شافعی نے مہر با زید	جماعت را وسنت را بجاں صید

آخر آخر میں مٹنے سے کچھ ہی پہلے اسی دہلی کے متعلق شاہ عبد العزیز فرماتے ہیں۔

یَا مَنْ یُسَائِلُ عَنْ دِهْلِیْ وَرِفْعَتِهَا	عَلَى الْبِلَادِ وَمَا حَازَتْهُ مِنْ شَرَفِ
اِنَّ الْبِلَادَ اِمَاءٌ وَهِیَ سَیِّدَةٌ	وَاَنَّهَا دُرَّةٌ وَالْكُلُّ كَالصَّدَفِ
فَاقَتْ بِلَادَ الْوَرٰى عِزًّا وَمَرْتَبَةً	غَیْرَ الْحِجَازِ وَغَیْرَ الْقُدْسِ وَالنَّجَفِ
سُكَّانُهَا خَیْرُ اَهْلِ الْاَرْضِ قَاطِبَةً	خُلْقًا وَخَلْقًا بِلَا عُجْبٍ وَلَا صَلَفِ
بِهَا مَدَارِسُ لَوْ طَافَ الْبَصِیْرُ بِهَا	لَمْ تَقْتَحِمْ عَیْنُهُ اِلَّا عَلَى الصُّحُفِ

[1] مولٰینا کا مرتب کردہ مسودۂ کتاب "التمہید" سے۔ یہ بیان آثار الصنادید مصنفہ سر سید سے ماخوذ ہے۔

كَمْ مَسْجِدٍ زُخْرِفَتْ فِيْهَا مَنَارَتُهُ — لَوْ قَابَلَتْهُ الشَّمْسُ الضُّحٰى تَنْكَسِفُ
لَا غَرْوَ اِنْ زَانَتِ الدُّنْيَا بِزِيْنَتِهَا — كَمْ مِنْ اَبٍ قَدْ عَلَا بِابْنٍ ذِي شَرَفٍ
وَمَاءُ جُوْنٍ جَرٰى مِنْ تَحْتِهَا فَحَكٰى — اَنْهَارَ خُلْدٍ جَرَتْ فِي اَسْفَلِ الْغُرَفِ

ترجمہ:-

اے دہلی[1] کی رفعت اور اس کی عظمت و شان کے متعلق سوال کرنے والے۔

دوسرے شہر اور بلاد کنیزیں اور لونڈیاں ہیں۔ اور دہلی مالکہ اور رانی۔ یہ موتی ہے اور باقی سب کے سب سیپیاں۔

کیا بلحاظ عزت اور کیا بلحاظ مرتبہ کے۔ دہلی سب شہروں کی سرتاج ہے، البتہ سرزمین حجاز، بیت المقدس اور نجف اشرف اس سے مستثنیٰ ہیں۔

دہلی کے رہنے والے شکل و شباہت میں اور اخلاق و اطوار میں دنیا جہاں والوں سے افضل اور اعلیٰ ہیں۔ نہ ان میں خود پسندی ہے اور نہ کبر و غرور۔

جس طرف نکل جائیے، اس میں مدارس نظر آئیں گے۔ اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوگا۔

---

[1] ۱۸۵۷ء میں دہلی جب بالکل مٹ گئی، تو اس مٹی ہوئی عظمت میں بھی ایسی ایسی نادر روزگار شخصیتیں باقی رہ گئی تھیں جن کی بدولت علی گڈھ کے مدرسۃ العلوم کی شمع جلی، دیوبند میں قدیم علوم و فنون نے نیا جنم لیا نیز اردو نثر میں سرسید، نذیر احمد۔ آزاد، ذکا، اللہ اور شعر و نظم میں غالب، حالی۔ داغ دہلی کی اسی عظمت رفتہ کی یادگاریں تھیں۔ جن کے فیض سے جلی ہوئی کھیتیوں کو پھر لہلہانے کا موقعہ ملا (سرور)

دہلی کی مسجدیں اس شان کی ہیں کہ اُن کے مناروں کی آب و تاب کے مقابلہ میں جب نصف النہار کا سورج آتا ہے تو وہ بھی مارے شرم کے چندھیا جاتا ہے۔

اگر دہلی کی زیب و زینت کی وجہ سے ساری دنیا دمک اٹھی ہے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ بیٹے اگر ہونہار اور قابل ہوں تو باپ دادا کا نام روشن ہوا ہی کرتا ہے۔

دہلی کے نیچے دریائے جمنا یوں بہہ رہا ہے جیسے یہ خلد بریں کی کوئی نہر ہے جو بہشت کے بالاخانوں کے نیچے بہ رہی ہو۔

بے شک محمد شاہ کے دور میں دہلی کی سیاسی حیثیت سلطنت کے عام زوال کی وجہ سے بہت گر چکی تھی۔ لیکن ذہنی اور فکری اعتبار سے دہلی کو ابھی گہن لگنا شروع نہیں ہوا تھا، امام ولی اللہ نے اِس دہلی کے ارباب فکر کو اپنی دعوت کا مخاطب بنایا تھا اور وہ دہلی کے اعلیٰ طبقہ کو متاثر کرنے میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس کے لئے دو تاریخی شہادتیں کافی ہیں، مرزا محمد مظہر جانجاناں فرماتے ہیں "حضرت شاہ ولی اللہ محدث رحمۃ اللہ علیہ نے نیا طریقہ بیان فرمایا ہے، اور اسرار معارف اور علوم کی گہرائیوں کی تحقیق میں ان کی اپنی خاص طرز ہے۔ موصوف اِن علوم و کمالات کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ علمائے ربانی میں سے ہیں۔ ان جیسے محقق صوفی کہ جو ظاہر و باطن کے علوم کے جامع ہوں اور انہوں نے نئے علوم بھی بیان کئے ہوں عہد گزشتہ میں بہت کم گزرے ہیں[1]"

---

[1] کلمات طیبات صفحہ ۸۳، ۸۴

شاہ ولی اللہ کی دعوت کی مقبولیت کی دوسری شہادت سلطان محمد شاہ کے دربار کا فیصلہ ہے۔ محمد شاہ امام ولی اللہ کے مدرسہ کو پُرانی دہلی کے اس چھوٹے سے احاطے میں دیکھنا نہیں چاہتے، بلکہ وہ شاہ جہاں آباد کا ایک پورا محلہ اس کے لئے خاص کر دیتے ہیں۔ یہی مدرسہ آگے چل کر ولی اللہی تحریک کا مرکز بنتا ہے۔ امام ولی اللہ اور اُنکے بعد امام عبدالعزیز اور پھر امام محمد اسحاق نے اسی مدرسہ میں بیٹھ کر اس تحریک کی رہنمائی کی۔ جس کے پیش نظر سلطنت دہلی کی تجدید تھی۔ اسی مدرسہ کے نمونہ پر غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ولی اللہی تحریک کے دوسرے دور میں مدرسہ دیوبند بنایا گیا۔

حکیم الہند نے اپنے پروگرام کی تدوین کے ساتھ ساتھ رفقار کی مرکزی جماعت بھی تیار کی، جو تعلیم و ارشاد کے ذریعہ اس انقلابی تحریک کی اشاعت ایک طرف صوفیہ اور علماریں اور دوسری طرف امرار و سرداران سلطنت میں کرتی رہی۔ اُن میں سے مولینا محمد عاشق پھلتی، مولوی نور اللہ بڈھانوی اور مولینا محمد امین کشمیری خاص طور پر مشہور ہیں، نیز آپ نے اطراف ملک میں اس مرکزی جمعیت کی شاخیں بھی قائم کرائیں۔ نجیب آباد کا مدرسہ، رائے بریلی میں دائرہ (تکیہ) شاہ علم اللہ حکیم الہند کی انقلابی تحریک کے مرکز تھے۔ سندھ میں ملا محمد معین کا مدرسہ ٹھٹہ بھی اُن کا ایک مرکز تھا جس سے مشہور عارف شاہ عبداللطیف بھٹائی خصوصی تعلق رکھتے ہیں۔

ہم شاہ صاحب کے الہامی خواب کا جو مکہ معظمہ میں ۱۱۴۴ھ میں آپ نے دیکھا تھا پہلے ذکر کر چکے ہیں، اس خواب میں حکیم الہند نے دیکھا تھا کہ "ملک الکفار مسلمانوں کے شہروں پر قابض ہو گیا ہے۔" اس خواب کا مشاہدہ

شاہ صاحب کو یوں کرایا گیا کہ لال قلعہ پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا۔ اور پھر آپ نے خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ "میں قائم الزماں ہوں، یعنی اللہ تعالےٰ کے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک ذریعہ بنایا گیا ہوں۔"

تیس سال بعد ۱۷۶۱ء میں معرکۂ پانی پت[۱] میں اس خواب کی تعبیر عمل میں آئی اور اس طرح شاہ صاحب نے دہلی کی حکومت کے اشتراک سے اپنے پروگرام کا ایک حصّہ مکمل کر لیا۔ چنانچہ پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کی کامیابی نے دہلی کے سیاسی افق کو مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے خطرات سے محفوظ کر دیا۔ اس واقعہ کے دو برس بعد ۱۱۷۶ھ یعنی ۱۷۶۳ء میں امام ولی اللہ نے وفات پائی۔

ہمارے اہل علم حکیم الہند کی تصانیف اگر غور سے پڑھیں تو اُن پر شاہ صاحب کے مخصوص نظریات واضح ہو جائیں گے۔ شاہ صاحب کے وہ افکار جو پہلی ہی نظر میں ان کی تصانیف میں سے آشکارا ہو جاتے ہیں ہم اُن میں سے نمونہ کے طور پر پانچ کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔

(۱) قرآن عظیم ایک انقلاب آفریں نظام کی دعوت دیتا ہے۔ یہ انقلاب آفریں نظام بین الاقوامی اور ساری انسانیت پر شامل ہے۔ رہتی دنیا تک جب بھی مسلمانوں کی کوئی جماعت اس پر عمل کرے گی تو اس سے وہی نتائج پیدا ہوں گے جو تاریخ اسلام کے دور اوّل یعنی خلافتِ راشدہ میں دنیا نے دیکھے، یہ قرآن کی تاثیر ہے۔ کسی آدمی یا زمانے کی تخصیص لغو ہے۔

---

[۱] نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے، اور شاہ صاحب ہی کے مشورہ پر انہوں نے اور ان کے رفقاء نے احمد شاہ ابدالی کو بلایا تھا۔

مسیحی دُنیا قرآن کی اس تاثیر کو عام نظروں سے اوجھل کرنے کے لئے برابر کوشاں رہتی ہے۔ مصر کے مشہور عیسائی مورخ اور مُصنف جرجی زیدان نے تو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت کا نظام محض بختُ اتفاق کا نتیجہ تھا، یعنی عہد گذشتہ میں اسلام کے عظیم الشان انقلاب کا باعث قرآن کی تعلیمات نہ تھیں، اتفاق سے چند افراد ایسے پیدا ہو گئے جنھوں نے ایک بار ایسا کر دکھایا، لیکن یہ کہ ہمیشہ یوں ہو غلط ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کے دُور رس انقلابی اثرات کو زائل کرنے کے لئے اور بھی حربے استعمال[1] کئے جاتے ہیں۔

(۲) قرآن کی تعلیمات کے اثر سے مسلمانوں میں جو اجتماعی تحریک عالم وجود میں آئی، وہ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے شروع ہو کر حضرت عثمان کے عہد خلافت میں شورش کے زمانہ تک منزہ اور اپنی اصلی حالت میں جاری رہی۔ قرآن حکیم کی عملی تفسیر کے طور پر اس اجتماعی تحریک کو جاننا ضروری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے، اسی شہر میں اسلام کی اجتماعی تحریک نے ایک مستقل نظام کی شکل اختیار کی۔ آپؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور

---

[1] زمانہ حال میں مجالس ہائے سیرت کا نظام بھی اس قسم کا ایک خواب آور نشہ ہے جو عوام مسلمانوں کو پلایا جا رہا ہے، تحریک کو چلانے والے یہ سمجھیں یا نہ سمجھیں، مگر جن لوگوں نے ان کو یہ لقمہ دیا، ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے دماغوں میں یہ خیال جمالیں کہ اسلام کی تمام اثر آفرینی قرآن کی بجائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نظیر شخصیت میں مضمر ہے۔ اگر آئندہ بھی کوئی ایسی شخصیت بر سر کار آگئی تو ممکن ہے کہ یہ اثر دوبارہ پیدا ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت انتظارِ مہدی میں بیٹھی ہے۔

میں مدینہ ہی اسلام کی تحریک کا مرکز و مصدر بنا رہا۔ بعد میں جب مسلمانوں میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں۔ اور حضرت علی رضؓ نے مدینہ کی بجائے کوفہ کو اپنا سیاسی مرکز بنایا۔ اور ان کے بعد امویوں نے دمشق میں اپنا دار الخلافت منتقل کر لیا۔ تو پھر بھی اسلام کی دینی اور فکری مرکزیت مدینہ ہی میں رہی۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن کے اثر و تاثیر سے جو نظام اجتماع معرض وجود میں آیا، اس کے اساس و مبادی اور تعلیمات اہل مدینہ کے ہاں محفوظ رہیں۔ بعد میں ان کو امام مالک نے اپنی کتاب موطا میں مدون کر دیا۔ اس لئے امام مالک کی موطاؔ کو حدیث و فقہ کی تمام کتابوں پر مقدم ماننا چاہیئے۔

(۳) قرآن عظیم نے اس آیت هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ تمام ادیان پر جس غلبہ کا دعویٰ کیا ہے، وہ خلافت راشدہ کے اس دور اول میں پورا ہو چکا ہے۔ یہ خیال کہ قرآن کا یہ دعوے ہنوز تشنۂ تکمیل ہے، صحیح نہیں۔ اور اس کے لئے کسی نبی یا ولی کا انتظار غلط ہے۔

لہ مسلمانوں میں دینی تعلیم اجتماعی طور پر مدینہ منورہ سے پھیلنا شروع ہوئی۔ اور حضرت عثمان کی شہادت تک یہ تسلسل قائم رہا۔ اسلئے اس خاص معاملہ میں مدینہ طیبہ کا مقابلہ نہ تو مکہ معظمہ کر سکتا ہے اور نہ بصرہ و کوفہ و بغداد۔ اس اساس پر ہم موطاء امام مالک کو قرآن شریف کے بعد اول درجہ پر اسلامی روایات کا مجموعہ مانتے ہیں، ہم امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ ائمہ محدثین کے بہت ممنون ہیں کہ انہوں نے موطاء کی اس شان کو برقرار رکھا۔ اور دوسرے دور میں اپنی اصطلاحات کے مطابق موطاء کو اول درجہ کی کتاب ثابت کر دیا۔

اس سلسلہ میں فرقہ شیعہ نے اہل بیت کے نام سے غلط پروپگنڈا کر کے مسلمانوں کی ذہنیت کو جس بری طرح سے مسموم کر دیا ہے۔ حکیم الہند اپنی تصانیف میں اس کا تدارک فرماتے ہیں۔

(۴) حکیم الہند دنیا اور آخرت کی فلاح کا سارا دارومدار ان چار بنیادی اخلاق کو قرار دیتے ہیں۔

طہارت یعنی پاکیزگی۔ اعلیٰ و برتر ذات خداوندی کے حضور میں خشوع و خضوع۔ سماحت یعنی ضبط نفس۔ عدالت، ان چار اخلاق میں مرکزی حیثیت عدالت کو ہے۔ کسی سوسائٹی میں عدل و انصاف پیدا نہیں ہو سکتا، جب تک رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے احتراز کلی نہ برتا جائے۔ نزول قرآن کے زمانہ میں کسریٰ و قیصر نے متمدن دنیا کے اکثر حصے کو اقتصادی پریشانی میں مبتلا کر کے اخلاق سے محروم کر دیا تھا، اس لئے قرآن عظیم کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ کسریٰ و قیصر کا زور توڑ کر ایسا نظام نافذ کر دیا جائے جس سے اقوام عالم کو اس مصیبت سے نجات حاصل ہو۔

(۵) قرآن عظیم کی اس انقلابی دعوت کو زندہ کرنے کا ارادہ جب کسی مسلم سوسائٹی میں پیدا ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرفائے قریش کے وہ خاندان جو مہاجرین اولین ہونے کا شرف حاصل کر چکے ہیں وہ ان کی ذہنیت، ان کی معاشی حالت اور ان کی معاشرتی سیرت کو اپنا امام بنائے۔

مسلمانوں میں اس انقلابی روح کو پیدا کرنے کے لئے حکیم الہند ع.ب.

زبان اور عرب[1] اول کی سیرت کو ایک معیار قرار دیتے ہیں۔ اس سے ان کا یہ مطلب نہیں کہ اگر سفہاء عرب جاہلیت کو زندہ کر رہے ہوں، تو اس صورت میں بھی انھیں کی تقلید کی جائے۔

حکیم الہند کے اس چوتھے اصول کو "کہ کسی سوسائٹی میں عدل و انصاف پیدا نہیں ہو سکتا، جب تک رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے احتراز کلی نہ برتا جائے" ہم اُس وقت تک نہیں سمجھ سکے۔ جب تک ہم نے یورپ میں جا کر سوشلزم کا مطالعہ نہیں کر لیا، جن رفقار نے ہمیں اس مطالعہ میں مدد دی وہ عموماً کارل[2] مارکس کے متبع تھے، اس کے احترام میں ہمارے یہ رفقار اس قدر مبالغہ

---

[1] عرب قوم کا اتباع اور چیز ہے۔ اور عرب اول کے انقلابی طبقے کا اتباع بالکل دوسری چیز ہے۔ انقلاب پیدا کرنے کے لئے انقلابی سیرت سامنے رکھنی چاہئیے، قریش میں سے مہاجرین کا طبقہ اپنے شہر کا حاکم تھا، انہوں نے گھر بار چھوڑ اپنی حکومت کو خیرباد کہا، پردیس میں جا کر اپنی محنت سے نئے گھر بنائے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ قرآن کے انقلاب کو کامیاب بنا سکیں۔ مہاجرین کی یہ سیرت قرآن سمجھنے کے لئے شمع ہدایت بن سکتی ہے لیکن ایک شخص اپنے گھر بار کا دلدادہ ہے اور چاہتا ہے کہ قرآن بھی سمجھے۔ ع این خیال است و محال است و جنوں،

ہم نے جب یورپ کے انقلابیوں کی اولوالعزمی دیکھی تو ہمیں اس کے مقابلہ میں اپنی قوم کی ذہنی پستی کو دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا مگر ہم اپنے نوجوانوں سے مایوس نہیں ہیں۔ البتہ "پیرانِ پارسا" کو ہم کوئی درجہ نہیں دے سکتے۔

[2] کارل مارکس مئی ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۸۳ء میں اس نے وفات پائی۔ اس کا اشتراکی

(بقایا صفحہ ۶۲ پر)

کرتے جس سے ہمیں تکلیف ہوتی۔ اس احترام اور فضیلت کا مدار وہ کارل مارکس کے اقتصادی نظام کو بتاتے تھے۔ ہم حیران رہ گئے جب اس قسم کے انقلابی پروگرام کے تمام حصے ہم نے حکیم الہند کی تصانیف میں جو کارل مارکس سے بہت پہلے گذرے ہیں نہایت بسط سے مدون پائے۔ امام ولی اللہ ۱۷۶۲ء میں فوت ہوئے اور کارل مارکس ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا۔

بقایا حاشیہ صفحہ ۶۱

مینی فیسٹو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا، اور اس کی قائم کردہ پہلی انٹرنیشنل کا اجلاس ۱۸۶۴ء میں منعقد ہوا جس میں اس کے پروگرام کا پہلی مرتبہ تعارف کرایا گیا، اس حساب سے شاہ صاحب رح پہلی انٹرنیشنل سے ۱۰۲ سال پیشتر اور مارکس کے اعلان اشتراکیت کی اشاعت سے ۸۵ سال پہلے وصال فرما چکے تھے۔

سراج الہند امام عبد العزیزؒ

۱۱۷۶ھ - ۱۲۳۹ھ

جب حکیم الہند امام ولی اللہ فوت ہوئے تو مولینا عبد العزیزؒ اُس وقت سترہ برس کے نوجوان تھے، اور ابھی طالب علمی سے بھی فارغ نہیں ہوئے تھے۔ مگر امام ولی اللہ کی مرکزی جمعیت نے مولینا عبد العزیزؒ ہی کو حزب ولی اللہ کا امام ماننے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے امام ولی اللہ کے طریقہ پر مولینا عبد العزیزؒ کی علمی تکمیل کی طرف توجہ کی گئی۔ مولینا محمد عاشق اور مولینا محمد امین نے علم حدیث اور ولی اللہی انقلابی تحریک کے اصول میں اور مولینا نور اللہ جو مولینا عبد العزیزؒ کے خسر بھی تھے فقہ میں ان کی علمی تربیت مکمل کی۔ اور انھیں امام عبد العزیزؒ کے درجہ تک پہنچایا۔

مولینا محمد عاشق، خواجہ محمد امین کشمیری اور مولینا نور اللہ یہ تینوں کے تینوں، امام ولی اللہ کے تربیت یافتہ مخصوص "راسخین فی العلم" گروہ کے سرگردہ بزرگ تھے۔ ان کے ذریعہ سے شاہ صاحب کے علوم محفوظ ہوئے، اور پھیلے۔ اِن کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کے شاگردوں کا ایک دُوسرا

طبقہ بھی پیدا ہوا، جس میں ان کی اولاد بھی داخل ہے۔ امام عبدالعزیز ان دونوں طبقوں کے مسلّمہ امام ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے خواص سے اگر دس آدمیوں نے استفادہ کیا، تو شاہ عبدالعزیز کے خواص سے دس ہزار مستفید ہوئے۔ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں تو دہلی کی اسلامی سلطنت میں ایک حد تک ابھی جان باقی تھی لیکن شاہ عبدالعزیز کے عہد میں تو یہ رہی سہی جان بھی ختم ہو گئی۔ اسوقت خاص دہلی میں انگریزی ریذیڈنٹ موجود تھا، اور ظاہر ہے انگریزی حکومت شاہ ولی اللہ، ان کے علوم اور ان علوم سے آگے چل کر جو نتائج مرتب ہونے کا امکان تھا ان سے ناواقف نہ تھی۔ لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے شاہ ولی اللہ کے علوم کو جس طرح بھی ہو سکا عام اہل علم تک پہنچا دیا۔

امام عبدالعزیز نے یہ کیا کہ ان کے زمانہ میں عام علماء جن علوم سے زیادہ مانوس تھے، موصوف نے خود بھی ان علوم میں خاص دلچسپی لی، آپ مروجہ کتابوں میں جو اقوال شاہ ولی اللہ کی تحقیق کے خلاف پاتے، ان پر بڑی لطافت سے بتدریج جرح کرتے جاتے، اور آخر میں بہت ہلکے الفاظ میں شاہ ولی اللہ کا قول نقل کر دیتے۔ اس طرح ولی اللہی فکر آسانی سے دماغ میں جذب ہو جاتا۔ لیکن آپ اس قول کو نہ اپنی طرف منسوب کرتے، اور نہ شاہ ولی اللہ کی طرف۔ اس طرح آپ عام اہل علم میں اتنی استعداد پیدا کر دیتے تھے کہ وہ امام ولی اللہ کی تحقیقات کو سمجھ سکیں، اس کی مثالیں آپکی تصنیف "تحفہ اثنا عشریہ" اور "تفسیر عزیزی" میں کثرت سے ملتی ہیں۔

لیکن اپنے خواص اہل بیت کو اور جو ان کے زمرہ میں شریک ہو سکا، آپ نے خاص طور پر شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا محقق بنا دیا۔ اس طرح امام عبدالعزیز نے کم از کم ساٹھ برس تک کام کیا، یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ کا علم اور ان کی حکمت لوگوں کے ذہنوں میں راسخ ہو گئی۔ اگر اس وقت یورپ کی ایک بڑی عقلمند انقلابی حکومت ہندوستان میں پاؤں نہ جما چکی ہوتی تو شاہ عبدالعزیز کے علوم کا یہاں اقتدار ہوتا۔ لیکن یہ یورپی حکومت صرف شاہ عبدالعزیز کے علوم کو برگ و بار لانے میں سدراہ ثابت نہ ہوئی، بلکہ اس کی تدبیروں نے ان علوم کی صورت کو اس طرح مسخ کیا کہ عوام اُن سے متنفر ہو گئے۔ البتہ جن لوگوں میں علمی ذوق موجود تھا، وہ اس مخالف پروپگنڈے سے متاثر نہ ہوئے۔

شاہ عبدالعزیز نے ایک طرف تو حکیم الہند کے علوم و حقائق کی اشاعت کی۔ اور دوسری طرف ان کا مقصد حیات یہ بھی تھا کہ شاہ ولی اللہ کی انقلابی دعوت کو ہندوستان میں عملی جامہ پہنائیں، شاہ ولی اللہ کو الہام کیا گیا تھا کہ "جن چیزوں کا تمہیں دینے کا وعدہ کیا گیا ہے، ان کے لئے کافی صبر کی ضرورت[1] ہے"۔ اس کام کو پورا کرنا شاہ عبدالعزیز کا مقصد تھا۔ شاہ عبدالعزیز کے ساتھ ان کے اپنے بھائی شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر بہترین معاون ثابت ہوئے۔ عقلی مسائل کے لئے جس قدر تحقیق کی ضرورت ہوتی، اُس کو شاہ رفیع الدین پورا کرتے رہے۔ کشفی مسائل میں

---

[1] تفہیمات صفحہ ۱۲

خصوصیت کے ساتھ شاہ عبدالقادر ممتاز تھے۔ نقلی علوم کی تعلیم شاہ عبدالعزیزؒ کے اپنے ذمہ تھی۔ اس طرح علم کے ان تینوں ذرائع۔ یعنی عقل، نقل اور کشف کی مدد سے ایک جامع سوسائٹی پیدا کرنے کی کوشش جاری رہی۔

اسی زمانہ میں امام عبدالعزیزؒ نے امام الانقلاب امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا۔ امیر المومنین نے انھیں یقین دلایا کہ عام طور پر فقہا اور صوفیہ کے مروجہ طریقے افراط و تفریط سے خالی نہیں۔ لیکن قرونِ اولیٰ کے مطابق صرف وہی طریقہ ہے جس کی دعوت امام ولی اللہ دیتے ہیں، امیر المومنین نے ان کی قلبی کیفیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا جسے امام عبدالعزیزؒ بیداری میں بھی اپنے اندر مستقر پاتے تھے۔ امیر المومنین نے انھیں پشتو[1] زبان بھی سیکھنے کی طرف بھی توجہ دلائی۔

شاہ عبدالعزیزؒ حقیقت میں ولی الٰہی تحریک کے سلسلے کے پہلے امام ہیں جنھوں نے حکیم الہند شاہ ولی اللہ کے اصول پر قومی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ شاہ ولی اللہ نے دہلی کے اعلیٰ طبقہ کو اپنے علوم سے متعارف کیا تھا۔ اور امرائے سلطنت کے اشتراک سے کسی قدر سیاسی کامیابی بھی حاصل کر لی تھی۔ یہ بات متحقق ہو چکی ہے کہ نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص عقیدتمندوں

---

[1] اس کی روح یہ ہے کہ ان کو پشتونوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ اس سے پہلے شاہ ولی اللہ اپنی کتاب "خیر کثیر" صفحہ ۱۱۳ میں لکھ چکے ہیں کہ حکومت چلانے کی استعداد مسلمانانِ ہند سے افاغنہ کی طرف منتقل ہو چکی ہے۔ اس سے ان کی مراد جنگی طاقت اور حربی قوت ہے جس قوم سے لڑنے مرنے کی طاقت سلب کر لی گئی ہو، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

میں سے تھے، اور شاہ صاحب ہی کے مشورے سے انہوں نے اور ان کے رفقاء نے احمد شاہ ابدالی کو قندھار سے بلایا تھا۔ اصل میں احمد شاہ کو بلانے میں شاہ صاحب کی روحانیت کام کر رہی تھی، اور نواب نجیب الدولہ اس میں ایک واسطہ بنے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے سلطنت دہلی کا نظام اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ امرائے حکومت میں سے کوئی بھی اس قابل نہ نکلا جو پانی پت کی فتح سے فائدہ اٹھاتا، اور ہندوستان کی اسلامی سلطنت کے مرکز کو انتشار اور تباہی سے بچا لیتا۔ البتہ بعض ارکان دولت نے اتنا کر لیا کہ چند صوبوں کی حکومتیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ ان چند ریاستوں کے سوا ہندوستان کے باقی حصوں پر مسلمانوں کی حکومت برائے نام رہ گئی۔

بیشک احمد شاہ ابدالی کی یلغار سے مرہٹوں کا زور ٹوٹ گیا تھا، اور پانی پت میں شکست کھانے کے بعد ان میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ وہ اکبر اور عالمگیر کے تخت کے مالک بننے کی دوبارہ خواہش کر سکتے۔ لیکن اس عرصہ میں انگریز بڑی سُرعت سے قوت پکڑ رہے تھے، چنانچہ اب انہوں نے بنگال اور مدراس پر قبضہ کرنے کے بعد شمالی ہند کی طرف توجہ کی۔ بکسر کی لڑائی میں جو ۲۳ر اکتوبر ۱۷۶۴ء کو ہوئی شاہ عالم ثانی انگریزوں کے ہاتھ آ گیا، بادشاہ نے اُن سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے تمام قلمرو کی نظامت کمپنی کو سپرد کر دی گئی، اور بادشاہ کے لئے قلعہ، اطراف دہلی تا حدود قطب صاحب کا علاقہ مخصوص کر دیا گیا، کمپنی کو باجگزار قرار دی گئی، مگر عملاً یہ قرار پایا کہ "ملک بادشاہ کا اور حکم انگریز کا"۔ مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور عام ہندوستانیوں کے لئے عموماً رعائتیں رکھی گئیں، مثلاً یہ

کہ حکومت کی زبان فارسی رہے گی۔ مسلمانوں کے مقدمات کا قاضی فیصلہ کریں گے، اور ہندوؤں کے مقدمات کا پنڈت۔ ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم فوت ہوئے اور ان کی جگہ اکبر ثانی بادشاہ بنے تو انگریزوں نے نئے بادشاہ کے دائرہ اثر کو اور بھی تنگ کر دیا۔ چنانچہ اس کی حکومت صرف قلعہ دہلی اور حدودِ شہر تک محدود کر دی گئی، اور باقی تمام ہندوستان کو کمپنی نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس طرح دہلی سے لے کر کلکتہ تک کے علاقوں پر انگریزوں کا ایک لحاظ سے معنوی تسلط ہو گیا۔ دہلی سے شمال کی طرف کے جو صوبے تھے۔ وہ ایک زمانہ ہوا ہندوستان کے مرکز سے پہلے ہی کٹ چکے تھے۔ چنانچہ امام ولی اللہ کے وقت میں نادر شاہ[17] نے کابل، قندھار اور ٹھٹہ کو ایران سے ملحق کر لیا تھا، اس سے پہلے قندھار کی افغانی حکومت جو میر اویس[18] سے شروع ہوئی تھی محمد شاہ کو اپنا بادشاہ مانتی تھی۔ نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی[19] نے کشمیر لاہور اور ملتان کے صوبے بھی دہلی سے چھین لئے۔ اس طرح یہ چھ صوبے دہلی کی حکومت سے الگ ہو گئے۔ ہم قندھار کی اس افغانی حکومت[20] کو بھی ہندوستانی حکومت مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی وہی حیثیت تھی جو نظام دکن کی حکومت کی تھی۔

۱۷۶۱ء کے قریب احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ قبضہ زیادہ عرصہ تک نہ رہا۔ ۱۸۰۰ء میں احمد شاہ کا پوتا زمان شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا، اس نے لاہور فتح کیا، وہ دہلی کی طرف کوچ کرنے کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا کہ انگریزی ڈپلومیسی نے اپنا کام کیا، اور افغانستان پر ایران کی جانب سے حملہ کروا دیا۔ ناچار شاہ زمان کو لدھیانہ سے واپس کابل کی طرف جانا پڑا۔

اس رواداری میں وہ رنجیت سنگھ کو پنجاب کا گورنر بنا تا گیا۔ یہی رنجیت سنگھ ہے، جس نے رفتہ رفتہ ۱۸۰۸ء یعنی ۱۲۲۳ھ میں پنجاب ملتان، کشمیر اور پشاور پر قبضہ کرکے ایک مستقل سکھ حکومت کی بنا ڈالی، اور انگریزوں سے مصالحانہ معاہدہ کر لیا۔

الغرض امام عبدالعزیز کے زمانہ میں ایک طرف کلکتہ سے لے کر دہلی تک انگریز معنوی لحاظ سے متسلط ہو چکے تھے، دوسری طرف دکن میں مرہٹے اور پنجاب میں سکھ زوروں پر تھے۔ ان کے مقابلہ میں لکھنؤ، حیدرآباد اور پھر میسور کی مسلم حکومتیں تھیں جو سلطان دہلی کا احترام کرتی تھیں۔ ہمارے خیال میں شاہ عبدالعزیز کے پروگرام کا بھی وہی خاکہ تھا، جس پر امام ولی اللہ پہلے عمل کر چکے تھے۔ آپ نے مرہٹوں کے تغلب کو دور کرنے کے لئے نواب نجیب الدولہ کے ذریعہ احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی تھی، اب شاہ عبدالعزیز کے عہد میں پنجاب پر سکھ قابض تھے، اور خاص دہلی میں انگریز آ گئے تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ کابل اور قندھار کی طاقت کو دعوت دے کر دہلی بلائیں، اگر وہاں کے امراء نا قابل ثابت ہوں تو عام لوگوں میں سے جو لائق افراد میسر آئیں۔ اُن سے مدد لی جائے۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ ان نواح میں امارت قائم کی جائے۔ بات دراصل یہ تھی کہ اُس زمانہ میں ہندوستان کی مسلمان اقوام میں سے صرف افغانوں میں جنگی طاقت اور حربی قوت موجود تھی۔ وہ لڑنا بھی جانتے تھے اور مردانگی اور شجاعت کے جوہر بھی رکھتے تھے، ان کو اگر منظم کر دیا جاتا تو اسلامی قومی حکومت کے

لئے ایک مضبوط فوج فراہم ہو سکتی تھی۔

یہ حالات تھے جن میں امام عبدالعزیز نے اپنے آپ کو گھرا ہوا پایا۔ ظاہر ہے ان کو انہی حالات کے مطابق اپنے لئے راہ عمل نکالنی تھی۔ چنانچہ امام عبدالعزیز نے اپنے کام کو جس خوش تدبیری سے سرانجام دیا، اُس کو دیکھ کر آپ کے کمال کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ مختصر الفاظ میں آپ نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ عوام مسلمانوں میں اسلامی عقائد و اخلاق کے متعلق جو غلط فہمیاں رائج ہو چکی تھیں، اُن کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی۔ عملاً اس کا مطلب یہ تھا کہ عوام دوسرے مرشدوں اور عالموں کو چھوڑ کر شاہ صاحب کے گرد جمع ہوتے، اور تحریک کی ترقی میں مخالف گروہوں کے لوگ دخل انداز نہ ہو سکتے، یہ امام عبدالعزیز کے پروگرام کا پہلا درجہ تھا، دوسرا درجہ یہ تھا کہ آپ نے انقلابی دعوتِ عام کے لئے ایک مرکز بنایا، جس کے ارکان اسماعیل شہید۔ سید احمد شہید اور مولانا عبدالحیٔ تھے اور شاہ اسحاق کو اپنی جگہ مقرر کیا۔ ہماری سمجھ میں اس نئی حزب کے امیر شاہ اسحاق تھے۔ سید احمد شہید امیر الدعوت اور امیر الجہاد تھے۔ امام عبدالعزیز کا اصل مقصد یہ تھا کہ آگے چل کر یہ جماعت دہلی کی سلطنت کی کمزوری کو دور کرنے کے لئے برسرِ کار آئے، یوں کہیئے کہ اس جماعت کی حیثیت حکومت موقتہ یعنی Provisional Government کی تھی۔ بظاہر دہلی کی فضاء اس کے لئے سازگار نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے لا محالہ اس جماعت کا افغانی علاقہ میں جانا ایک لازمی امر تھا افغانوں میں چونکہ ایک سیّد کی امارت بہت جلد مقبول ہو سکتی ہے۔ اسی غرض کے پیش نظر سید احمد شہید کو امیر جماعت مقرر کیا گیا۔ اور مولینا

اسماعیل شہید اور مولینا عبدالحی ان کے وزیر تجویز ہوئے۔

یہ ہے امام عبدالعزیز کے ساٹھ سال کی دعوت و عمل کا ایک مختصر سا خاکہ۔ موصوف نے بتدریج اس کام کو کس طرح چلایا، اب اس کی تفصیلات سُنیئے۔

امام عبدالعزیز نے سب سے پہلے فتوٰی[1] دیا کہ ہندوستان کے جس قدر حصّے غیر مسلم طاقت کے قبضہ میں جا چکے ہیں، ان قطعات میں اگرچہ برائے نام سلطان دہلی کا دخل مانا جاتا ہے لیکن وہ سب کے سب دارالحرب ہیں، امام عبدالعزیز کے نزدیک سلطان دہلی کی برائے نام حکومت ملک کو دارالاسلام نہیں بنا سکتی۔ چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جو زبردست قوتیں موجود ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ یا تو یہاں سے ہجرت[2] کر جائیں یا دشمن سے لڑ کر اپنی نئی اسلامی حکومت بنائیں۔ ہر

---

[1] اس فتوٰی کی تفصیل کے لئے فتاوی عزیزیہ جلد اول طبع مجتبائی صفحہ ۱۷ و ۱۸۵ ملاحظہ ہو۔

[2] ہجرت کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ یہاں کی اکثر آبادی ہندوؤں سے مسلمان ہوئی ہے، انکے مرشد اور اُستاد بیشک باہر سے آئے اور پھر بادشاہوں نے یہاں ایسے خاندان جو حکومت کرتے چھوڑے مگر ایسی حالت میں کہ اب ان کے پاس حکومت نہیں رہی، یہ تینوں (استاد مرشد خاندان شاہی) طبقے ایسے ہیں جو ہندوؤں سے مسلمان نہیں ہوئے۔ لیکن ان کو اپنا ملک چھوڑ کر اتنا زمانہ گزر چکا ہے کہ انھیں وطن میں کوئی شخص نہیں پہچانتا، ایک سید اگر مکہ معظمہ میں جائے تو عام ہندُستانی کی طرح سمجھا جائے گا۔ یہی حال افغانوں کا افغانستان میں اور ترکوں کا ترکستان میں ہے۔ ہمارے سامنے نہایت شریف افغان خاندانوں سے تعلق رکھنے والے تعلیمیافتہ ہندُستانی نوجوان کابل میں آئے تاکہ وہ اپنی قومی حکومت کی ترقی میں مدد دیں، مگر وہ عام ہندوستانیوں سے زیادہ ذلیل ہو کر واپس گئے۔ لہذا ہم نہیں مانتے کہ کوئی ہندُستانی ہندوستان سے ہجرت کی استعداد رکھتا ہے۔ اس لئے ان کا فرض یہی ہوگا کہ دارالحرب میں رہ کر اس کو دارالاسلام بنانے کی سعی کریں۔

وہ شخص جو دارالحرب میں رہتا ہو، اس کا یہ مذہبی فرض ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اسلامی حکومت کا نظام دشمنوں کی غالب طاقت کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو تو یہ فرض عام مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔ ملت اسلامیہ کا اس سے تغافل برتنا اور اس معاملہ میں کچھ نہ کرنا شریعت کی نظر میں حرام ہے۔ جب یہ حالت ہو تو مسلمانوں کے ہر ہر فرد پر واجب ہے کہ وہ دشمنوں کے غلبہ کو ختم کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرنے کا ارادہ کرے، اور پھر جیسے جیسے حالات پیش آتے رہیں اسی لحاظ سے اجتماعی نظام قائم کرتا رہے۔

امام ولی اللہ نے تو دہلی کے اعلیٰ طبقے سے اپنے علوم کا تعارف کرایا تھا، مگر امام عبدالعزیز نے قوم کے متوسط طبقے کو بیدار کر کے عوام کو اس حقیقت سے آشنا کر دیا۔ یہی قومی حکومت کی تاسیس ہے۔ بفضلہ تعالےٰ امام عبدالعزیز اپنے مشن میں کامیاب ہوئے اور اسی بنا پر سراج الہند کہلائے۔

تاریخ اسلام میں اس قسم کا ایک واقعہ گزر چکا ہے۔ جسے تاریخ نے امام عبدالعزیز کے زمانہ میں ایک بار پھر دہرایا، دوسری ہجری کے اوائل میں جب بنو عباس ایرانی نومسلموں کی مدد سے اموی حکومت پر غالب آ رہے تھے، اُس وقت امام ابو حنیفہ نے اپنی خدا داد فراست سے عراقی[1] فقہ کو عقلیت کے اعلیٰ اصولوں پر مدون کیا۔ یہ فقہ اگر اسی حالت میں رہتی جو امام ابو حنیفہ کی ذہنیت کا نتیجہ تھی تو اعلیٰ عقلمندوں کے سوا دوسروں کے لئے اس تک رسائی مشکل ہو جاتی اور جیسے بہت سے اور ائمہ مذاہب کے فقہی طریقے عام نہ ہو سکے۔ اور

---

[1] عراقی فقہ وہ ہے، جسے عراق کے عرب ائمہ، صحابہ اور تابعین مرتب کر چکے تھے۔

آہستہ آہستہ مٹ گئے، یہ فقہ بھی فروغ نہ پائی۔ مگر اللہ تعالےٰ کی رحمت نے عجمی ذہنیت کی آسانی کے لئے فقہ حنفی[1] کی ترویج کے سامان پیدا کر دیئے، امام ابو یوسف نے جو امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں سے عربی نسل کے ذکی الفطرۃ استاد تھے، امام محمد کو اپنا رفیق بنایا۔ اور ان دونوں نے اپنے استاد کی فقہ کو متوسط طبقے تک پہنچانے کا کام پورا کر دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تک امام ابو حنیفہ

---

[1] اقوام میں کسی تحریک کو محفوظ کرنے کا یہ طریقہ ہے، جو چیز متوسط طبقہ میں آجائے وہ فنا نہیں ہوتی ادنیٰ طبقہ اُس کی تقلید کر لیتا ہے اور اعلیٰ طبقہ جو کچھ کہتا ہے، اُسکی عملی صورت یہی ہوتی ہے جو متوسط طبقہ میں ہے۔ شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ میں اسکو رسوم سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک حقیقت اور حکمت کو جبتک رسم نہ بنایا جائے۔ وہ انسانیت کیلئے مفید نہیں ہو سکتی۔ امام ولی اللہ تمام شرائع الٰہیہ کے اندر رسوم کو مرکز مانتے ہیں۔ قرآن عظیم نے اس کو معروف کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

ہماری قوم کے ذکی الفطرۃ عقل مند اعلیٰ علوم فوراً لے لیتے ہیں، مگر ان کو متوسط طبقے تک پہنچانا ضروری نہیں سمجھتے۔ کیونکہ انہوں نے حکمت عملی کسی استاد سے نہیں سیکھی، ان کی ساری محنتیں خود انکی اپنی ذات تک محدود رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ انکی اولاد بھی ان کے مشرب کی تائید نہیں کرتی، واقعہ یہ ہے کہ امام ولی اللہ حضرت مجدد الف ثانی امام ربانی کے بعد ایک عظیم الشان مجدد ہیں۔ انہوں نے اپنے اتباع میں سے عمل کرنے والے افراد کی ایک جماعت تیار کر دی، جس نے شاہ صاحب کے علوم کو عوام تک پہنچانا اپنے لئے ضروری سمجھا۔ ہمارے اہلحدیث بھائیوں کا یہ حال ہے کہ وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے دقیق مسائل سے حظ اٹھاتے ہیں، مگر یہ نہیں دیکھتے کہ آیا یہ لطیف علوم ہندوستان کا متوسط طبقہ بآسانی قبول کر سکتا ہے؟ دراصل ان لطیف علوم کے لئے تو عربی ذہنیت زیادہ موزوں ہے۔ ہمارے اہل حدیث بھائیوں نے بڑی بڑی محنتوں سے چھوٹی چھوٹی مسجدیں بنائی ہیں، اور یہ لوگ اس خیال سے اپنی طبیعتوں کو تسلی دے لیتے ہیں کہ زمانہ قیامت قریب آگیا ہے۔ اس لئے ہماری تحریکیں کامیاب نہیں

(بقایا صفحہ ۷۶ پر)

کا مذہب دُنیا میں قائم ہے

اللہ تعالیٰ کی غیر متناہی رحمت کا یہ ایک کرشمہ تھا کہ امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے واقعہ سے ملتا جلتا ایک واقعہ دہلی کی تاریخ میں دہرایا گیا۔ اگر امام عبدالعزیز اپنے والد ماجد امام ولی اللہ کی حکمت، ان کی فقہ و تصوف و فلسفہ اور سیاست کے مخصوص طریقے متوسط طبقے تک نہ پہنچاتے تو آج امام ولی اللہ کو صحیح طور پر پہچاننے والا مشکل سے دستیاب ہو سکتا۔ اور ہندوستانی مسلمان اس نعمت سے جو تمام انسانیت کے لئے بھی ابر رحمت ہے محروم ہو جاتا۔

الغرض امام عبدالعزیز نے سب سے پہلے امام ولی اللہ کے علوم کو علماء زمانہ کے ذہنوں تک پہچانے کے لئے تصانیف کا سلسلہ شروع کیا۔ امام ولی اللہ کی تفسیر "فتح الرحمان" کو سمجھانے کے لئے "فتح العزیز" لکھی۔ فتح العزیز کو ہر ایک عالم بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ مگر یہ لوگ اس کو فتح الرحمان کے غوامض حل کرنے کا ذریعہ نہیں بناتے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ولی اللہ نے اپنی کتاب الفوز الکبیر میں قرآن سمجھنے کے جو اصول وضع فرمائے تھے، اُن کے مطابق قرآن دانی مفقود ہو رہی ہے۔ مثلاً حروف مقطعات کی جو تفسیر شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں، اُس کا سمجھنا بہت مشکل ہے، اور فتح العزیز میں "الم" کی تفسیر پڑھنے کے بعد وہ چیز آسان ہو جاتی ہے۔ نیز فتح العزیز میں عوام کی طبیعت کو جذب کرنے کے لئے ایسی باتیں بکثرت مذکور ہیں، جو ان کے نزدیک مسلمات میں

(حاشیہ بقایا صفحہ ۳، سے) ہوتیں۔ ان لوگوں کو چاہیئے کہ شاہ ولی اللہ کی حکمت کا مطالعہ کریں۔ اس کے بعد وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی متوسط طاقت کو جو حنفی مذہب رکھتی ہے، پریشان کرنا خود بخود چھوڑ دیں گے، یہ امام عبدالعزیز کی طے شدہ مصلحت ہے جس پر ان کے اتباع جب تک کام کرتے ہیں، کامیاب رہیں گے۔

سے بھی ہیں بیشک اُس میں بعض چیزیں حدیث کے فنِ تنقید کی رو سے غیر ثابت بھی آجاتی ہیں، لیکن یہاں اُن کا مطلب تنقید سکھانا نہیں۔ بلکہ اپنے والد امام ولی اللہ کی حکمت کو عوام تک پہنچانا ہے۔ چنانچہ وہ غیر ثابت حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بنا کر پیش نہیں کرتے بلکہ اُسے محض اس لئے پیش کرتے ہیں کہ اُن کے مخاطبین کے نزدیک اس کی حیثیت ایک مسلّم امر کی ہے۔

شیعوں کی طرف سے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور اُن کی خلافت پر جو اعتراضات ہوتے تھے، ان کے ردّ میں امام ولی اللہ نے اپنی مشہور کتاب "ازالۃ الخفا" لکھی تھی۔ شاہ عبدالعزیز نے اس کتاب کے مقدمہ کے طور پر کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" تصنیف کی، بات یہ تھی کہ شیعوں نے پہلے تو قرآن مجید کی صحیح معرفت اور علم کو امام مہدی کی آمد کے ساتھ مشروط کر دیا تھا، اور اس کے بعد امام مہدی کی آمد کے متعلق عجیب عجیب توہمات کے پردے ڈال دیئے۔ عملی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیعیت کی دعوت مسلمانوں کو قرآن عظیم کی برکاتِ عامہ سے محروم کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی۔ ادھر ایرانی حکومت کی مسلسل کوشش سے فرقہ اثنا عشریہ نے امام عبدالعزیز کے زمانہ میں شمالی ہند میں اپنا مرکز بنا لیا تھا۔ چنانچہ اُن کے مسموم پروپیگنڈے سے متوسط طبقوں کے ذہنوں کو بچانے کے لئے شاہ عبدالعزیز نے کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" لکھی۔ علماء زمانہ "تحفہ اثنا عشریہ" کو تو مزے لے کر پڑھتے رہے، لیکن انہوں نے اسے امام ولی اللہ کی تصنیف "ازالۃ الخفا" کو سمجھنے کا واسطہ نہ بنایا، اور اس طرح اس کتاب کے لکھنے کا جو اصل مقصد تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ یورپ کی قومیں جو پہلے عیسائی تھیں اور آج کل نیچری ہیں، قرآن عظیم کے انکار کے باوجود اس کے معارف اور اصولوں سے رہنمائی حاصل کر رہی ہیں، ان کے برعکس مسلمان ہیں کہ قرآن پر کامل ایمان رکھتے ہیں لیکن یہودیوں کی طرح محض الفاظ کی تلاوت پر اکتفا کر رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے سامنے قرآن کا کوئی واضح پروگرام نہیں رہا اور وہ شیعوں کی طرح کسی بڑے رہنما کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ امام ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کا طریقہ مسلمانوں میں اس مرض کی جڑیں اکھیڑنے کا ضامن ہے۔

امام ولی اللہ نے علوم دینی کی تحصیل کے سلسلہ میں امام مالک کی کتاب موطا پر بہت زور دیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے وصیت نامہ میں فرماتے ہیں کہ جب مبتدی طالبعلم عربی زبان سمجھنے کے قابل ہو جائے تو موطا امام مالک جو یحیٰی بن یحیٰی کی روایت کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے، مطالعہ کرے۔ اُسے چاہیئے کہ اس سے مطلق بے توجہی نہ برتے، کیونکہ علم حدیث کی اصل و اساس یہی کتاب ہے۔ اور اس کے پڑھنے میں بڑے فائدے ہیں۔ اس کے بعد وہ قرآن کا مطالعہ کرے۔ اور اُس کا طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ پہلے ترجمہ و تفسیر کے بغیر صرف قرآن پڑھے۔ اور اگر اس میں کوئی نحو یا شانِ نزول کا مسئلہ مشکل نظر آئے، تو وہاں رک جائے، اور اس پر سوچ بچار کرے۔ جب وہ اس طرح قرآن کے مطالعہ سے فارغ ہو جائے تو پھر تفسیر جلالین پڑھے مطالعہ کا یہ طریقہ بڑا مفید ہے۔

غرضیکہ امام ولی اللہ کے معارف میں مؤطا امام مالک کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ امام ولی اللہ نے اُسے اپنے مذاق کے مطابق نئی ترتیب بھی دی۔

اور اس کا نام "المسوّی من الموطا" رکھا۔ حدیث و فقہ میں امام عبدالعزیز نے اپنے والد حکیم الہند سے، یہی کتاب پڑھی تھی، اور آپ نے خاندان کے نوجوانوں کی تربیت میں اسی کتاب کو قرآن عظیم کے بعد اساس بنایا، اور اس طرح اپنے زمانہ کے علمار کو اس طرف متوجہ کیا۔ امام ولی اللہ کی مرتب کردہ "المسوّی" کو پوری توجہ سے پڑھا جائے، تو فقہ حنفی میں محققین[1] پیدا ہو سکتے ہیں، موطا کو اس طرح پڑھنے کی برکت تھی کہ ہم نے اپنی سیاحت میں مولینا شیخ الہند اور ان کے مشائخ سے زیادہ عقلمند فقہا اسلامی ممالک میں نہیں دیکھے۔ ہم نے حرم محترم کے علمار کو امام ولی اللہ کی "المسوّی" پڑھائی، وہ اس کی قدر کرنے لگے۔ انہوں نے اس کو اپنے مطبع میں چھاپا اور اسے اپنے مدارس کے نصاب میں داخل کیا۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت مولینا شیخ الہند ایک زمانہ ہوا امام ولی اللہ کی کتابوں کو دار العلوم دیوبند کے درجہ تکمیل میں داخل کرنے کی ہدایت دے چکے ہیں۔ مگر ابھی تک اس پر عمل نہیں ہوا۔ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰهِ۔

درس و تدریس کے اس نصاب کے بعد امام ولی اللہ قریش کی زبان اور اُن کی اعتدال پسند معیشت و معاشرت کو اپنی اولاد میں خاندانی مفاخر کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ "وصیت نامہ" میں ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم یہاں غریب الدیار ہیں۔ ہمارے آبار و اجداد باہر سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ ہمارے لئے عربی نسب اور عربی زبان باعث فخر ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ہمیں سید اوّلین و آخرین، افضل انبیار و مرسلین، فخر موجودات علیہ وعلی آلہ الصلوات والتسلیمات

---

[1] یعنی مجتہد منتسب جیسے ابن الہمام وغیرہ۔

سے نزدیک کرتی ہیں۔ اس نعمتِ عظمیٰ کا شکریوں ادا کرنا چاہئے کہ جہاں تک ہو سکے ان عادات و رسوم کو جو عربِ اوّل[1] کے ساتھ مخصوص تھیں اور یہی دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ومقصود بھی تھا۔ ہم ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ اور رسومِ عجم اور عاداتِ ہنود کو اپنے اندر نہ آنے دیں۔" امام ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں قیصر و کسریٰ کے تعیشات اور تکلفات کی بڑی مذمت کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "ھدیٰ" یعنی طریقہ کو ان لعنتوں کا برباد کرنے والا بتایا ہے۔ اسی لئے شاہ ولی اللہ اپنی اولاد کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہیں کہ قرآن کے انقلاب کو بار دیگر وجود میں لانے کے لئے ضرورت ہے کہ معیشت اور معاشرت میں وہ اخلاق و اوصاف پیدا کئے جائیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے ساتھیوں کے تھے۔

امام عبدالعزیز نے اپنے والد کی اس وصیت پر عمل کرتے ہوئے اُس عہد کی سرمایہ داری اور اس کی ترقی یافتہ صورت شاہنشاہی کی لعنتوں کو اس طرح بے نقاب کیا کہ شرفاء کے ایک صالح گروہ کے لئے ان کا سمجھنا مشکل نہ رہا۔ چنانچہ امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ نوجوان سوسائٹی کو ناز و نعم کی ان رسموں سے پاک کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے جو جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد اقبال کی یادگار کے طور پر چلی آتی تھیں! اور اب اس زمانہ میں جب کہ سلطنت و اقبال کبھی کے رخصت ہو چکے تھے، اور افلاس کا دور دورہ تھا۔ یہ رسمیں اعلیٰ خاندانوں[2] کی

[1] عرب اوّل کی اتباع کے معنی ہیں؟ اس کی تفصیل ملاحظہ ہو صفحہ نمبر

[2] انسان اگر اپنی معاشی ضرورتوں میں لگا رہے تو اس کا دماغ فراغت سے کوئی اعلیٰ فکر نہیں سوچ سکتا۔ اس سے ہمتیں خود بخود پست ہو جاتی ہیں، چنانچہ جب تک خاندان کی زندگی کا بوجھ ہلکا نہ کر دیا جائے، اولو العزم طبائع اپنے سامنے ترقی کا راستہ بند پاتی ہیں، وہ خاندان کو چھوڑ نہیں سکتے اور خاندان کے بارے انہیں ایک لمحہ کے لئے فرصت نہیں ملتی۔

ہمت کو گھن کی طرح کھا رہی تھیں۔ ان نوجوانوں نے اس کام کو بڑی خوش اسلوبی سے سر انجام دیا۔ ان اصلاح یافتہ خاندانوں کی خواتین کے ایثار سے ہزاروں مجاہدین کا لشکر دس سال تک روٹی کھاتا رہا۔ اور کسی فرعون اور قارون کے سامنے سر جھکانے پر مجبور نہ ہوا[1]، ورنہ اُس وقت دولتمند طبقوں کا یہ حال تھا کہ اُن کے اندوختہ خزانوں پر اوباش نوجوان اور بد اخلاق عورتیں مسلط تھیں۔

امام عبدالعزیز کی اس تربیت کی برکت تھی کہ بعد میں سید احمد شہید کی قیادت میں ہندوستانی مسلمانوں کے اعلیٰ خاندانوں کے ناز و نعمت میں پلے ہوئے نوجوانوں کا لشکر سندھ کے راستہ قندھار و کابل ہو کر پشاور پہنچا۔ اور اُن پہاڑوں اور جنگلوں میں مرنے مارنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ان تربیت یافتہ نوجوانوں کا ایک نمونہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی ہیں۔ ۱۲۰۵ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ فتح علی صاحب کے بیٹے

---

[1] دعاۃ مسجدوں میں وعظ کرتے۔ خاندانوں کے پاس کچھ اندوختہ نہ تھا، عورتیں اپنا زیور دے کر ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ اس کے ثبوت میں مدراس کے خان عالم کی بہو کا واقع سوانح احمدیہ میں موجود ہے، خود ہمیں اپنا تجربہ ہے۔ کہ دہلی میں ہم نہایت تنگ حالی میں پہنچے، مولانا شیخ الہند کے حکم سے کام شروع کر دیا، ہمیں ڈھاکہ کے شریف خاندانوں کی خواتین سے روپیہ ملتا رہا۔ اس کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم کے دو سو روپیہ ماہوار عطیہ سے ہم دہلی میں بیٹھ سکے۔ اس سے پہلے ہم نے جب سندھ میں مولانا شیخ الہند کے ارشاد پر ۱۳۱۰ھ میں کام شروع کیا تو جناب پیر صاحب العلم کے خاندان کی محترم خاتون نے اپنا سنہری ہار (عقد) بھیج دیا۔ نیز ہجرتِ کابل کے موقعہ پر شیخ عبدالرحیم سندھی کی بیوی، اور ان کی لڑکیوں نے اپنا تمام سنہری زیور بیچ کر ہمارے لئے زادِ راہ مہیا کیا، اور کوئٹہ تک ہمیں پہنچا کر نقدی ہمارے حوالے کی۔

اور رفیع الدین حسین خاں صاحب کے نواسے تھے جو صوبہ بہار کے ناظم و رئیس تھے۔ آپ نانا کے بڑے لاڈلے تھے، ہر وقت ریشمی یا زریں لباس یا ڈھاکہ کی جامدانی اور تن زیب کا جوڑا زیب تن رہتا تھا، اور خوشبو و عطر سے معطر رہتے تھے۔ انگلیوں میں سونے کی انگشتریاں اور چھلے ہوتے، لکھنؤ میں تھے تو وہاں کے شوقین، خوش پوشاک، رنگین مزاج نوجوانوں میں آپ کا شمار تھا۔ سید صاحب (سید احمد شہید) کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی حضرت مصعب بن عمیر کی طرح کیفیت بدل گئی اب وہ لکھنؤ اور عظیم آباد کے بانکے نوجوان نہ تھے، بلکہ سید صاحب کی جماعت کے ایک جفاکش مزدور اور معمولی خادم تھے۔ رائے بریلی میں مولینا شہید سے حدیث پڑھتے۔ اور آپ کی جماعت کے نائب تھے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر سر پر اٹھا کر لاتے، اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے، اور مٹی گارے کا کام کرتے۔[1]

امام عبدالعزیز نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ان تربیت یافتہ افراد کی ایک مرکزی جمعیت بنائی جس میں سب سے پہلے اپنے تینوں بھائیوں مولینا رفیع الدین، مولینا عبدالقادر اور مولینا عبدالغنی کو رکھا، سب سے چھوٹے مولینا عبدالغنی پہلے (۱۲۲۷ھ) فوت ہوگئے، اس لئے اہل دہلی ان سے زیادہ آشنا نہ ہوئے۔ اور "حضرات ثلثہ" کا لفظ اہل دہلی کی زبان میں امام عبدالعزیز اور ان کے دو بھائیوں کے لئے بولا جاتا رہا، اس جمعیت کی سعی سے نوجوانوں کی ایک اور جماعت تیار ہوگئی۔ اس جماعت کے سرکردہ بھی تین یا چار بزرگ تھے، مولینا اسمٰعیل شہید، مولینا عبدالغنی کے صاحبزادے (۲) مولینا عبدالحئی دہلوی۔ مولینا نور اللہ کے

---

[1] سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۵۴

پوتے اور امام عبدالعزیز کے داماد (۳) مولینا محمد اسحاق، امام عبدالعزیز کے نواسے (۴) مولینا محمد یعقوب دہلوی متوفی ۱۲۸۲ھ جو مولینا محمد اسحاق کے بھائی تھے۔ سید احمد شہید اس حزب کے ساتھ منضم کئے گئے۔

خواص کی ان جماعتوں کو تیار کرنے کے ساتھ ساتھ امام عبدالعزیز نے عوام کو اپنے مقاصد سے آشنا کرنے کے لئے ہفتہ میں دو بار وعظ کہنا شروع کیا، اور اس پر آپ آخر عمر تک عمل پیرا رہے۔ ہفتہ میں دو بار منگل اور جمعہ کو دہلی کوچہ چیلان پرانے مدرسہ میں مجلس وعظ منعقد ہوتی تھی جس میں خواص وعوام مور و ملخ سے زیادہ جمع ہو جاتے تھے۔ طرز بیان ایسا دلکش تھا کہ ہر مذہب کا آدمی مجلس وعظ سے خوش ہو کر اٹھتا تھا۔ آپ کی کوئی بات کسی کو گراں نہ گزرتی تھی۔ اس کے ساتھ پابندی کا یہ عالم تھا کہ اشتداد مرض کے زمانے میں جب ان کے وعظ کا دن آیا تو آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ مجھے اٹھا کر بٹھا دو، اور دو آدمی مونڈھے پکڑے رہو۔ لیکن جب بیان کرنا شروع کر دوں تو دونوں شخص مجھے چھوڑ کر علیحدہ ہو جائیں۔ چنانچہ ارشاد تعمیل ہوئی اور آپ نہایت اطمینان سے وعظ کہتے رہے، گو لب و لہجہ میں ناتوانی اور کمزوری کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن استقلال ویسے ہی رنگ جمائے ہوئے تھا۔[1]

امام عبدالعزیز کے ان وعظوں سے عوام میں مستقل بیداری پیدا ہوتی اور خواص ان سے یہ سیکھتے کہ وعظ کے ذریعہ عوام کی کس طرح تربیت فکری کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ تربیت یافتہ خواص آپ کی تحریک کے داعی بن کر ہندوستان کے ہر گوشہ

---

[1] ش، م صفحہ ۲۲۱

میں پھیل گئے، اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ ایک عالم[1] نے سارے ہندستان کی سیاحت کی۔ اور اُسے علم حدیث کا کوئی بھی استاد ایسا نہ ملا جو امام عبدالعزیز کا شاگرد نہ ہو۔

عام وعظ و تبلیغ کے سلسلہ کے علاوہ امام عبدالعزیز کے ساتھ ساتھ ان کی مرکزی جمعیت کے دونوں طبقوں کے ارکان نے آپ کے طریقہ و منہاج پر خواص اور عوام کی تربیت کے لئے مختلف کتابیں بھی لکھیں۔ خواص کے لئے مولینا رفیع الدین نے اسرار المحبۃ اور تکمیل الاذہان نام کی کتابیں لکھیں، اور ان کے علاوہ متعدد رسائل تصنیف کئے۔ یہ دراصل امام ولی اللہ کے فلسفہ ہی کی تشریحیں تھیں۔ نیز "حملۃ العرش" کی تحقیق میں ان کا ایک رسالہ نہایت بلند اور اعلیٰ فکر پیش کرتا ہے۔ چنانچہ امام عبدالعزیز نے وہ رسالہ اپنی تفسیر میں نقل کر دیا ہے، ایسا ہی سورۂ نور کی تفسیر میں مولینا رفیع الدین کا رسالہ بے نظیر ہے۔

خواص کو حکیم الہند امام ولی اللہ کے فلسفہ کی باریکیوں سے متعارف کرنے کے لئے مولینا اسماعیل شہید نے "عبقات" لکھی۔ اس میں آپ نے شیخ محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ اور امام ربانی شیخ احمد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ کی تحقیقات پر بحث کرتے ہوئے امام ولی اللہ کی حکمت کا ان سے مقابلہ کیا۔ اور اُن پر حکیم الہند کی حکمت کا تفوق ثابت کیا ہے۔ عوام کے لئے مولینا رفیع الدین نے قرآن عظیم کا لفظی ترجمہ ہندی[2] میں کیا۔

---

[1] یہ عالم غیر ہندستانی تھے۔ نام یاد نہیں رہا ہے۔ (مولینا نور الحق علوی)

[2] واضح رہے کہ اس زمانہ میں اردو کو عموماً ہندی ہی کہا جاتا تھا۔

اس کی مدد سے دہلی کے عوام امام عبدالعزیز کے وعظ سے پوری طرح مستفید ہوتے رہے، نیز مولینا عبدالقادر[1] نے قرآن عظیم کا بامحاورہ ترجمہ کیا "موضح القرآن" کے ذیل میں آپ کے تشریحی ارشادات آج تک علمائے محققین کے لئے بصیرت افروز ہیں، مولینا عبدالحی نے لغات القرآن[2] لکھی اور مولانا اسمٰعیل شہید نے اپنی عربی کتاب "ردّ الاشراک" کا ترجمہ

---

[1] شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کے متعلق "واقعات دہلی" صفحہ ۵۰۰ میں مذکور ہے کہ یہ ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں ہوا، شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کا ایک ایڈیشن مطبع مفید عام آگرہ میں نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ والیئے بھوپال کے حکم سے چھپا تھا، اس میں شاہ عبدالقادر کا دیباچہ بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں "اس بندۂ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا جس طرح ہمارے والد بزرگوار حضرت شیخ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی فارسی ترجمہ کر گئے ہیں۔ سہل و آسان اب ہندی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کرے۔ الحمد اللہ کہ ۱۲۰۵ھ میں میسر ہوا" کچھ عرصہ بعد آپ نے بعض فوائد "موضح القرآن" کے تاریخی نام سے لکھے۔ اس عبارت سے خیال گزرتا ہے کہ شاہ عبدالقادر اپنے بھائی کے اردو ترجمہ سے مطلع نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ شاہ رفیع الدین نے اسی سال یا اس کے بعد ترجمہ لکھا بعض پرانے ثقات سے سنی ہوئی بات ہے کہ شاہ رفیع الدین نے صرف چند پاروں کا ترجمہ کیا، اور مولانا عبدالحی نے اسے پورا کیا، دونوں ترجموں پر مولوی نذیر احمد نے اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں جو تبصرہ لکھا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے۔

[2] "لغات قرآن" فارسی زبان میں ہے اور طبع ہو چکی ہے، ہمیں طالب العلمی کے زمانہ میں دیوبند میں مفت تقسیم ہو کر ملی تھی۔ مکررات کو حذف کر کے وہ علی الترتیب، مشکل الفاظ کا ترجمہ فارسی میں دیتے جاتے ہیں، مثلاً لاریب فیہ میں "ریب" کا ترجمہ "متقین" کے معنی۔ وعلی ہذا القیاس اس طرح سے لغت یاد ہو کر قرآن عظیم کا سمجھنا سہل ہو جاتا ہے۔

"تقویۃ الایمان" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب اگر پانچسو برس پہلے لکھی جاتی تو ہندوستانی مسلمان دنیا کے مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ جاتا۔ اس کے علاوہ مولینا محمد اسحاق نے حدیث کی کتاب "مشکوٰۃ" کا بھی ہندی میں ترجمہ کیا۔

امام عبدالعزیز کی تعلیم و ارشاد کا اثر ہندوستان سے باہر حجاز کے ذریعہ استانبول تک پہنچا۔ غالباً شیخ خالد کردی اس میں واسطہ بنے۔ شیخ موصوف نے مولینا غلام علی کی خدمت میں سلوک کی تکمیل کی تھی، اور مولینا اسماعیل شہید کی صحبت کے توسط سے امام عبدالعزیز سے مستفید ہوئے تھے۔

لہ یعنی ان میں شرکیہ رسوم کا اثر نہ آنے پاتا۔ حنیفی طریقہ ہندوستان کی پرانی سیکالوجی سے بہت مناسبت رکھتا ہے۔ اگر یہ تعلیم ایک ہندوستانی سلیم الفطرۃ کو ملتی، تو وہ دوسری قوموں سے اسلامیت میں بہت بڑھ جاتا، ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ بغداد سے جب علوم خراسان آئے تو وہ لوگ تشبیہ اور تجسیم کے جھگڑوں میں اس قدر پریشان ہوئے کہ اسلام کی صحیح تعلیم سے پیچھے رہ گئے، ہندوستانی تجلی الٰہی کے مسئلے کو بہت آسانی سے سمجھ سکتا ہے، اور حنیفی طریقہ بھی اس تجلی الٰہی کے ذریعہ سارے علوم و اسرار معرفت الٰہی سکھاتا ہے۔ تجلی کے مسئلے کو خراسانیوں نے نہیں سمجھا، اسلئے مسلمانوں کو انہوں نے اس وجہ سے بہت پیچھے ڈال دیا۔ اور قرآن ان کی ذہنیت پر منطبق ہی نہیں ہوتا۔ جب تک وہ اس کی کوئی تاویل نہ کریں۔ صوفیاء کرام نے اس مصیبت کو کم کرنے کی یقیناً کوشش کی، مگر وہ صاحب بیان نہ تھے کہ علماء ان سے استفادہ کرتے۔ بیشک وہ صاحب حال ہیں، جو انکی صحبت میں پہنچا رنگا گیا۔

"کتاب التمہید" میں شاہ اسماعیل شہید کے متعلق مولانا فرماتے ہیں: "اسلام کے اظہار سے پہلے میں نے شاہ صاحب کی تقویۃ الایمان پڑھی تھی، چنانچہ رد شرک کے متعلق مجھے اس سے بڑا فائدہ پہنچا، بلکہ ایک لحاظ سے یہ کتاب مجھے اسلام میں لانے کا ذریعہ بنی، غرضیکہ امام محمد اسماعیل میرے استاد اور امام ہیں اور مجھے ان سے بہت محبت ہے۔ ایسی محبت جس طرح لوگ اپنے مذاہب کے ائمہ سے کرتے ہیں۔ موصوف نے ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ میں شہادت پائی"۔ (اصل عربی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا) سرور

شیخ خالد کردی کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس میں موصوف نے بیان کیا ہے کہ میں علمائے خراسان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن طبیعت مطمئن نہ ہوئی۔ میں نے دہلی میں مولینا غلام علی کی خدمت میں جانے کا ارادہ کیا تو وہ لوگ مانع ہوئے مگر میں ان کے اثر میں نہ آیا، اس قصیدہ کا ایک شعر ہے۔

بدہلی ظلمت کفر است، گفتند و بدل گفتم
بظلمت رو اگر در جستجوئے آبِ حیوانی

خالد کردی کے شیخ طریقت مولینا غلام علی بھی امام عبد العزیز کے اصحاب میں سے تھے۔

استانبول کے علماء کی طرف سے امام عبد العزیز کی خدمت میں یہ دعوت[1] نامہ آیا کہ آپ آستانہ تشریف لائیں تو یہاں کی تمام علمی جماعتیں آپ کی سیادت میں کام کریں گی، لیکن امام عبد العزیز نے اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ کے ہندوستانی کام کی تکمیل سے علیحدہ ہونا پسند نہ کیا۔

حکیم الہند امام ولی اللہ نے اپنی دعوتِ فکر اور نظام اجتماع کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو جماعت بنائی تھی، اُس کی اپنی امتیازی خصوصیات تھیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے امام ولی اللہ، امام عبد العزیز اور ان کے رفقاء کی کتابیں نہیں پڑھیں وہ حزب ولی اللہ کے ان امتیازی خصوصیات کو ابھی

---

[1] یہ روایت زبانی ہے اور مشائخ دیوبند میں سلسلہ بہ سلسلہ چلی آتی ہے، کہا جاتا ہے کہ مولینا رحمت اللہ مہاجر مکی کا استانبول سے تعلق تھا، اور دعوت میں ایسے الفاظ تھے کہ ہم آپکی کفش برداری کو فخر سمجھتے ہیں۔ مولوی محمد حسین بٹالوی کی "اشاعۃ السنۃ" میں غالباً اس کے متعلق کچھ مواد مل سکے۔

طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اس حزب کے مقاصد کے بارے میں بہت کم عربی زبان میں لکھا گیا ہے۔ البتہ عربی سے زیادہ فارسی زبان[1] میں۔ اور پھر خالص ہندی یعنی اردو میں حزب ولی اللہ پر کتابیں تحریر ہوئیں۔ عربی چونکہ دنیائے اسلام کی مشترک زبان تھی اور اس میں حزب ولی اللہ کے متعلق بہت کم لکھا گیا تھا، اس لیے عربی اور ترکی ممالک ولی اللہی تحریک سے زیادہ روشناس نہ ہو سکے۔

اس ضمن میں یہ بات ضرور پیش نظر رہنی چاہئے کہ امام ولی اللہ اور امام عبد العزیز کے زمانہ میں بیرون ہند میں جس قدر اسلامی تحریکیں پیدا ہوئیں جیسے ایران میں بابی، نجد میں وہابی اور یمن میں زیدی۔ ان سب کے اپنے اپنے خاص پروگرام تھے اور حزب ولی اللہ کی ہندوستانی تحریک نہ تو ان میں سے کسی سے مقصد میں اشتراک رکھتی ہے، اور نہ کسی تحریک سے اس کا طریق عمل مشابہ ہے۔ حزب ولی اللہ کی بابی تحریک کے ساتھ مشابہت تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی، کیونکہ بابی تحریک ایرانی شیعیوں کی تحریک تھی۔ اور اس کے برعکس ولی اللہی تحریک کے اساسی اصولوں میں سے ایک یہ تھا کہ عوام و خواص کو دو شیعی غلطیوں سے بچایا جائے۔ البتہ عرب کی نجدی تحریک سے ولی اللہی تحریک بعض امور میں اشتراک رکھتی ہے، اس لیے ظاہر بین دونوں کو یکساں سمجھ لیتے ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ کے ماننے والوں میں سے سرزمین نجد میں ۱۱۱۵ھ میں محمد بن عبد الوہاب پیدا ہوئے، انہوں نے لوگوں کو توحید

---

[1] ہندی فارسی میں، نہ کہ ایرانی فارسی میں۔

کی دعوت دی۔ حزب ولی اللہ میں بھی توحید کی دعوت اسی طرح موجود ہے۔ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا احترام بھی دونوں تحریکوں میں مسلّم ہے۔

امام ولی اللہ جب حجاز تشریف لے گئے تو انہوں نے شیخ ابراہیم کُردی مدنی کے کتب خانہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تصنیفات سے کافی استفادہ کیا تھا۔ امام ولی اللہ کی کتاب "ازالۃ الخفا" میں بعض اساسی مسائل[1] ایسے ہیں، جو یقیناً شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تصنیف منہاج السنۃ سے لئے گئے ہیں۔ شیخ ابراہیم کردی کے متعلق ابجد العلوم صفحہ ۸۴۶ میں لکھا ہے کہ "موصوف علوم فقہ وحدیث اور عربی میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ آپ نے اس سلسلہ میں کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ موصوف نے بغداد، شام، مصر اور مکہ و مدینہ کی سیاحت

---

[1] فتنۂ عثمان سے پہلے جو زمانہ گزرا، اس کے متعلق شاہ ولی اللہ کا یہ نظریہ ہے کہ صحابہ میں اختلاف ہوا ہی نہیں۔ البتہ جس قدر اختلاف مروی ہے، وہ مشورہ کرنے میں جیسے اختلاف ہوتے ہیں، اس نوعہ کا ہے، مگر یہ کہ صحابہ کے فیصلہ میں اختلاف ہوتا، ایسا کبھی نہیں ہوا، وہ جب مشورے کے لئے بیٹھتے، تو ایک نہ ایک فیصلہ پر متفق ہو کر اُٹھتے اس پر شاہ صاحب نے ازالۃ الخفا میں بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ یہ ان کی بہت بڑی علمی اساسی چیز ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ منہاج میں اس کو ایک آدھ سطر میں لکھ جاتے ہیں، مگر بہر حال اس امر کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی، ہم شاہ ولی اللہ کی اس لئے عزت نہیں کرتے کہ وہ تمام چیزیں از خود ایجاد کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ شاہ صاحب سلیم الفطرت ہیں۔ اور ائمہ متقدمین کی صحیح باتیں اخذ کر لیتے ہیں۔ یہ ان کی عظمت کا راز ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ شیخ اکبر اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ دونوں کی اچھی تحقیقات یکساں طریقہ پر قبول کرتے ہیں۔

کی۔ اور القشاشی کی صحبت میں بیٹھے، اور ان سے حدیث کی روایت کی۔ شیخ فارسی، کردی، ترکی اور عربی یکساں بولتے تھے، آپکی مجلس رونق و تازگی میں خلد بریں کا ایک نمونہ ہوتی۔ موصوف حکمت و فلسفہ کے حقائق پر صوفیہ کے ارشادات کو ترجیح دیا کرتے اور فرماتے کہ یہ فلسفی حقیقت کے قرب و جوار تک تو پہنچ جاتے ہیں، لیکن حقیقت کا ادراک ان کے بس میں نہیں، آپ کی وفات کی تاریخ اِنَّا عَلٰی فِرَاقِكَ یَا اِبْرَاهِیْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ ہے۔ چنانچہ امام ولی اللہ اپنے شیخ ابراہیم کی اتباع میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی یکساں عزت کرتے ہیں اور دونوں کی عظمت کے معترف ہیں، لیکن وہ اس میں امام ربانی شیخ احمد سرہندی کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک امام ربانی کے بعض[1] بیانات کے اغلاق سے اُن کے مطالب کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ ولی اللہی تحریک عرب کی نجدی تحریک سے بعض امور میں مشابہ تھی، اس کی ایک مثال اسماعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان ہے۔ یہ کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے ماخوذ ہے۔ لیکن بعض مقامات پر اس میں شیخ عبدالوہاب کی کتاب "التوحید" کی طرح ایک سی بات لکھی ہے۔ یہ اسباب ہیں جن کی بنا پر ہندوستان کے وہ اہل علم جو حزب ولی اللہ کے مخالف تھے ان مشترک مباحث کی وجہ سے دونوں تحریکوں کو ایک ثابت کرنے کے لئے کافی سے زیادہ کوشاں رہے، لیکن اگر ولی اللہی تحریک کے اساس و مبادی

---

[1] ان بیانات کی تفصیل ملاحظہ ہو ضمیمہ امام ربانی۔

پر اچھی طرح سے غور کیا جائے تو دونوں تحریکوں کی کلی مشابہت دور ہو جاتی ہے، امام ولی اللہ کی عقلیت اور ان کا فلسفہ وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر مرتکز ہے، اور تو اور وہ امام ربانی کے وحدۃ شہود کے عقیدہ کو بھی وحدت الوجود کے ساتھ مطابقت دیتے ہیں، دوسری طرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہیں، جو وحدت الوجود کے ماننے والوں سے اس قدر شدید نفرت رکھتے ہیں کہ دنیا جانتی ہے، ظاہر ہے جب دونوں تحریکوں کے اساس و مبادی میں اس قدر اختلاف ہے تو ان کو محض بعض امور میں مشابہ ہونے کی وجہ سے ایک نہیں کہا جا سکتا۔

تحریک ولی اللہی[۲۶] اور نجدی تحریک میں عدم مشابہت کی ایک اور مثال سنئے۔ مولینا اسماعیل شہید تقویۃ الایمان میں "التوسّل فی الدعا" کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور "شرک[۱] اصغر" کے مرتکب کو کافر نہیں مانتے، گو اسے غیر مغفور سمجھتے ہیں۔ تقویۃ الایمان کے یہ دو اساسی مسئلے ہیں جو کتاب التوحید کے مناقض ہیں۔ اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پیرو ایسے لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتے، جو ان دو مسئلوں میں مولینا محمد اسماعیل شہید کے تابع ہوں۔ ایسی حالت میں دونوں تحریکوں کو ایک جاننا سطحی نظر اور سرسری طور پر سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

عرب کی ایک دوسری تحریک کے جو یمن سے تعلق رکھتی ہے ایک بزرگ امام شوکانی[۲۷] ہیں۔ جو بڑے محقق اور محدث تھے۔ حزب ولی اللہ کے

---

[۱]، [۲] تفصیل ملاحظہ ہو، ضمیمہ جات میں

کے پیرووں میں سے بعض فرقے مستقل طور پر امام شو کانی کی متابعت کا دم بھرتے ہیں، ان کے نزدیک اتباعِ سنت کی تفصیلی دعوت میں امام شو کانی بھی حزب ولی اللہ کے شریکِ کار ہیں، لیکن حقیقت شناس جانتے ہیں کہ شو کانی زیدی ہیں۔ اور گو حنفیہ سے بعض مسائل میں وہ متفق ہیں۔ پھر بھی وہ "حجۃ اجماع"[1] پر صاف رائے نہیں رکھتے۔ قاضی شوکانی کی کتاب ارشاد الفحول" اور مولانا اسماعیل شہید کا رسالہ "اصول فقہ" ملاکر پڑھئے تو فرق واضح ہوجائیگا۔

دراصل اگر کوئی بزرگ امام ولی اللہ کی تحریک کے لئے سلف صالح کا مرتبہ رکھتے ہیں تو وہ فقط امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ہیں۔ ان کو امام ولی اللہ اپنے طریقہ کا ارہاص[2] مانتے ہیں۔ امام ربانی نے جو کام شروع کیا تھا، امام ولی اللہ نے اس کو مکمل کردیا۔

الغرض امام عبد العزیز اور ان کی مرکزی جمعیت کی تعلیمی، تبلیغی اور فکری اور عملی جدوجہد سے جب ولی اللہی تحریک کے مبادی کا تعارف ملت سے

---

[1] حجۃ اجماع پر مدار ہے، صدیق اکبر کی خلافت کا مصحفِ عثمانیؓ کے مسلّم اور متبوع ہونے کا۔ اس زمانے میں ہم اجماع کی بجائے مرکزی جمعیت کا فیصلہ کہہ سکتے ہیں، آج جس چیز کو مرکزی جمعیت کا فیصلہ کہا جاتا ہے وہی اس زمانے میں اجماع سے مقصود تھا۔ اجماع یا مرکزی جمعیت کے فیصلہ کو قانونی طور پر حجت سمجھے بغیر کوئی سیاسی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی، شیعہ اجماع کی اس قانونی حجیت کو نہیں مانتے۔ مگر اہل سنت کا مدار ہی سراسر اسی پر ہے۔ ظاہر ہے اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو دونوں مسلکوں کا فرق صاف نمایاں ہوجاتا ہے۔

[2] ارہاص سے مراد یہاں راہ صاف کرنے والا ہے۔ مثلاً ہمیں عمارت بنانا ہے، تو زمین میں جس قدر نشیب و فراز ہیں۔ ان کو ہموار کرنا ارہاص کا درجہ رکھتا ہے۔

اچھی طرح سے ہو گیا، تو اس وقت امام عبد العزیز ایک ایسے نوجوان کی راہ دیکھ رہے تھے جو عسکری معاملات سے دلچسپی رکھتا ہو تاکہ اس کے ذریعہ اپنی انقلابی تحریک کے دوسرے حصہ کی تکمیل کرائیں۔ اللہ کی رحمت سے رائے بریلی کے سید شاہ علم اللہ کے خاندان کا ایک نوجوان سید احمد[۲۹] امام عبد العزیز کی دعوت میں شرکت کے لئے آیا۔ موصوف انھیں اس مطلب کے لئے زیادہ موزوں سمجھتے تھے، اس لئے انکی تربیت کی طرف خاص توجہ کی جانے لگی۔

سید شاہ علم اللہ؎ عالمگیری عہد کے مشہور عالم ربانی اور صاحب سلسلہ شیخ تھے، ان کے فرزند سید محمد ضیاء اور ان کے بیٹے شاہ ابو سعید ہیں۔ آپ سید احمد شہید کے جد مادری اور امام ولی اللہ کے خلیفہ تھے۔ شاہ علم اللہ کا دائرہ رائے بریلی میں تھا، اور ولی اللہی تحریک کے ابتدائی مرکزوں کے سلسلہ میں اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ سید احمد شہید صفر ۱۲۰۱ھ میں اسی دائرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سید محمد عرفان تھا، سید احمد شہید نے عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا محمد اسحاق اور مولانا اسماعیل شہید سے پڑھیں، قرآن مجید کا ترجمہ اور حدیث مولانا عبد القادر کے درس میں سنتے رہے۔ اور انھیں کی صحبت میں سلوک کی تکمیل کی۔ سید احمد شہید کے متعلق (سر) سید احمد دہلوی اپنی کتاب آثار الصنادید میں لکھتے ہیں "سید احمد بریلوی در آں حال میں شوقِ طالب علمی میں سے وارد شاہ جہاں آباد ہو کر مسجد اکبر آبادی میں فروکش ہوئے، اور صرف و نحو میں فی الجملہ سواد حاصل کیا۔ اکثر خدمت مسجد اور اس مقام کے واردوں، خصوصاً

؎ سنہ [illegible]

درویشانِ پاک طینت کی جو تحصیل علم باطنی کے شوق میں جناب مولینا عبدالقادر کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، خاطر داری اور سرانجام مہام میں ایسے سرگرم ہوئے گویا اس امر کو اہم مہام سمجھے ہوئے تھے۔

جب ذکر اللہ سید احمد شہید کی طبیعت میں راسخ ہو گیا، تو ان کی عالی دماغی اور اولو العزمی سے ایسے کلمات صادر ہوتے، جو ایک ایسے مصلح کی زبان سے نکلتے ہیں، جو تمام انسانیت کو راہ راست پر لانا چاہتا ہو۔ امام عبدالعزیز نے یہ کلمات سنے تو فرمایا تِلْكَ خَيَالَاتٌ تُرَبِّي بِهَا اَطْفَالُ الطَّرِيْقَة[1] یعنی اس طرح ان کے فطری جوہر کی تربیت ہو رہی ہے۔ ۱۲۲۵ھ بمطابق ۱۸۱۰ء میں امام عبدالعزیز نے سید احمد شہید کو فوجی تربیت کے لئے امیر خاں والئی ٹونک کے لشکر میں بھیجا۔ موصوف نواب مرحوم کے لشکر میں چھ سال سے زائد رہے۔ ۱۲۳۱ھ یعنی ۱۸۱۶ء میں جب نواب امیر خاں نے انگریزوں سے صلح

---

[1] جب کوئی پہلوان شاگردوں کو کشتی سکھاتا ہے تو یوں کرتا ہے کہ خود ان کے آگے گر جاتا ہے۔ شاگرد سمجھتا ہے کہ میں نے استاد کو گرا لیا۔ اس سے اصل میں اسکی تربیت مقصود ہوتی ہے، یہی مثال سید احمد شہید کی تھی۔ ان کی زبان سے بلند باتیں سرزد ہوتی ہیں کہ میں یوں کر دوں گا۔ اس طرح کر دکھاؤں، اس سے ان میں عالی حوصلگی پیدا ہو رہی تھی، سید صاحب کا ایک جملہ "سوانح" میں منقول ہے "کہ انہوں نے اپنے اہل بیت میں سے کسی آدمی سے کہا کہ اگر تمہیں کوئی کہے کہ سید احمد فوت ہو گیا ہے، تو جب تک تم یہ نہ دیکھو کہ ہندوستان سے کفر نکل گیا ہے، اور افغانوں سے فلاں فلاں عیب جاتے رہے اور عربوں سے فلاں فلاں خرابی دور ہو گئی، ترکوں کی فلاں کمزوری رفع ہو گئی ہے۔ جب تک یہ ساری باتیں پوری نہ ہو لیں، کبھی یقین نہ کرنا کہ سید احمد فوت ہو گئے۔" یہ ہے ترجمہ تلك خيالات تربى بها اطفال الطريقة یعنی عالی حوصلگی۔

کرلی تو سید احمد شہید واپس امام عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچ گئے۔

امام عبدالعزیز کے خواص اصحاب جن کے رگ و ریشہ میں حزب ولی اللہ کی خصوصیات سرایت کر چکی تھیں، اور ایک لمبے زمانے سے ان کی تربیت ہو رہی تھی، یہ وہ لوگ تھے جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ سید احمد شہید در اصل اس حزب میں سے نہ تھے۔ بلکہ بعد میں ان کے ساتھ منضم[1] کئے گئے، موصوف میں کشفی کمالات تھے، سپاہ گری کی تعلیم تھی۔ اور پھر آپ سید تھے، اس لئے امام عبدالعزیز نے ان کو امارت جہاد کے لئے موزوں سمجھا، لیکن ان کے ساتھ اپنے تکمیل تربیت یافتہ افراد میں سے دو وزیر مقرر کر دیئے، حقیقت میں جہاد کی قیادت اس منتخب بورڈ کے ہاتھ میں تھی گو امارت سید احمد شہید کے سپرد کی گئی تھی، اس تقسیم کار کو سمجھنے کے لئے امام ولی اللہ کی کتاب "بدور بازغہ" سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ حکیم الہند نے اجتماع انسانی کی تمدنی ضروریات کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے، قضا، شہریاریت، جہاد، نقابت، انذار و تبشیر ان میں ہر ایک کی تکمیل کے لئے ایک ایسے کامل کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کام کو چلانے کی خصوصی مہارت رکھتا ہو، ان پانچ رہنماؤں کے ساتھ ایک ایسا امیر بھی چاہیئے، جس کو ان تمام کاموں میں مہارت کاملہ حاصل ہو۔

---

[1] سید صاحب نے امام عبدالعزیز کو لکھا "خاکسار قدم بوسی کو حاضر ہوتا ہے، یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہوگیا، نواب صاحب انگریزوں سے مل گئے۔ اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔" سیرت صفحہ ۱۷۰

[2] یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا نے امیر شہید کا (مستقل عنوان سے) تذکرہ نہیں کیا۔ محمد نور الحق

وہی حقیقی طور پر امام بننے کا مستحق ہے۔ وَالرَّجُلُ الْوَاحِدُ الْمُتَكَفِّلُ بِهَا جَمِيْعًا هُوَ الْإِمَامُ الْحَقُّ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے، اکثر تو یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان میں سے دو یا تین کاموں کو ایک آدمی اپنے ذمہ لے لیتا ہے اور باقی کاموں کو دوسرا آدمی۔ مدینہ ناقصہ[1] میں تو ہر کام کا ایک نہ ایک رواج بن جاتا ہے۔ اور جو شخص اس کام کا کرتا دھرتا ہوتا ہے وہ اسی رواج کے مطابق اپنی رائے دیتا ہے۔ اور کام چلانے کی تیسری صورت یہ ہے کہ قوم کے ممتاز اور عقل مند لوگ باہم مل بیٹھتے ہیں۔

آج کل کی زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حقیقی امام کا جو ڈکٹیٹر بن سکے پیدا ہونا آسان نہیں اس کے نہ ملنے پر حکومت کی تشکیل ان تین صورتوں میں سے کسی ایک پر ہو سکتی ہے (۱) چند افراد کا ایک بورڈ بنا دیا جائے (۲) اگر محدود سوسائٹی ہو تو اس کا ہر ایک حصہ اپنے مسلمہ رواج کو مانے اور اپنے رئیس کی اطاعت میں قومی قانون کی پابندی کرے یعنی سوسائٹی کو حکومت بنانے کی ضرورت ہی نہ ہوگی، ان میں اس قسم کے اختلافات پیدا ہی نہیں ہوتے جن کی وجہ سے وہ امام بنانے پر مجبور ہوں۔ (۳) عقلمندوں یا عوام کے مقبول لوگوں کا اجتماع ہو، یعنی پارلیمنٹ بنے۔

دراصل بات یہ تھی کہ امام عبد العزیز کے آخری عہد میں ہندوستان

---

[1] مدینہ تامہ سے مراد وہ اجتماع ہے جس میں باقاعدہ حکومت ہو، اور مدینہ ناقصہ جہاں منظم حکومت نہ ہو، آج کل کی اصطلاح میں اسے سوسائٹی کہتے ہیں، انارکسٹ حکومت کو نہیں مانتے، ان کے نزدیک سوسائٹی پر انسانی ترقی رک جاتی ہے

کی اسلامی سیاست میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے بعد کام
کرنے کے لئے اپنے لوگوں میں سے کسی میں امامت کی صلاحیت نہ دیکھی
کہ اس کو ڈکٹیٹر بناتے۔ اس لئے دو بورڈ بنا دیئے گئے۔ عسکری امور کیلئے
سید احمد شہید امیر اور مولینا عبدالحی اور مولینا محمد اسماعیل شہید مشیر مقرر ہوئے۔[1]
چنانچہ امام عبدالعزیز نے اپنی تمام جماعت کو حکم دیا کہ جس معاملہ میں سید احمد شہید
مولینا عبدالحی، مولینا اسماعیل شہید تینوں جمع ہو جائیں، اس کو امام عبدالعزیز
کا حکم سمجھنا چاہئے۔ تنظیمی امور کے لئے آپ نے مولینا محمد اسحاق کو امیر اور مولینا
محمد یعقوب (برادر مولینا محمد اسحاق) کو ان کا مشیر مقرر کیا، شاہ عبدالعزیز نے مولینا
محمد اسحاق کو ہر معاملہ میں اپنے ساتھ شریک[2] رکھ کر لوگوں کو سمجھا دیا کہ ان کا حکم میرا
حکم ہے۔ امام عبدالعزیز کا یہ فیصلہ فقط امام ولی اللہ کے اصول پر ٹھیک اُترتا ہے۔
یہ طریقہ کار تھا، جس پر چل کر امام عبدالعزیز نے اس طویل عرصہ میں
بتدریج حزب ولی اللہ کی تنظیم کی۔ چنانچہ جب یہ تمہیدی مراحل طے ہو گئے
تو آپ نے ۱۲۳۱ھ میں پہلی دفعہ سید احمد شہید اور ان کے بورڈ کے ارکان

۱؎ بعد میں یہ غلطی ہوئی کہ شاہ عبدالعزیز کے فیصلہ یعنی بورڈ کی حکمت کو نہ سمجھ کر سید صاحب کو امیر مطلق یعنی امام کے درجہ پر مان لیا گیا اور یہ ان لوگوں کی مداخلت سے ہوا جو امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ نہ تھے، آخر کار جو شکست ہوئی اس میں اس اصولی تبدیلی کا بہت بڑا دخل ہے۔

۲؎ شاہ عبدالعزیز کے اس خصوصی سلوک کا نتیجہ تھا کہ لوگوں کو شاہ اسحاق کی امامت قبول کرنے میں کوئی عذر پیدا نہ ہوا۔ گو "سوانح احمدیہ" کا مصنف شاہ اسحاق کی حیثیت کم کرنا چاہتا ہے، مگر دنیائے اسلام میں ایک عالم بھی ایسا نہیں ملتا جو اپنا سلسلۂ اسناد شاہ عبدالعزیز تک پہنچائے اور شاہ اسحاق بیچ میں واسطہ نہ ہوں

مولینا عبدالحی اور مولینا اسمٰعیل کو اطراف ملک میں بیعت طریقت لینے کی غرض سے بھیجا۔ ۱۲۳۶ھ میں دوسری دفعہ یہ بورڈ جہاد کی بیعت لینے کیلئے دورہ پر نکلا۔ اس کے بعد ان کو سارے قافلہ سمیت حج پر جانے کا حکم ملا۔ تاکہ انھیں اپنی قوت کی مزید تنظیم کا تجربہ حاصل ہوسکے۔

سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کار کے ان دوروں کی اہمیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ولی اللہی تحریک کے ایک اصول کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ امام ولی اللہ کے نزدیک جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ اسلام کی مستقل حکومت کا آغاز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے ہی ہوچکا تھا۔ اور آپ کے دُعاۃ، یعنی دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے اس مستقل حکومت کے امیر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ کے ۔۔ پر حزب ولی اللہ کی تنظیم میں بھی دُعاۃ کے سلسلہ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ امام عبدالعزیز نے امیر شہید، مولینا عبدالحی اور مولینا محمد اسمٰعیل کو دراصل اسی سلسلۂ دعاۃ کا نظام قائم کرنے کے لئے اطراف ملک میں روانہ کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ گویا ابتدا تھی اس امر کی کہ حزب ولی اللہ اپنی سیاسی پارٹی کی تشکیل و تنظیم کرکے اب امارت اور حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتی ہے۔ یعنی یہ لوگ اپنی حکومت بنائیں گے اور جہاد کریں گے۔

۱۲۳۹ھ میں یہ قافلہ جب حج سے واپس آیا، تو امام عبدالعزیز فوت ہوچکے تھے۔ اور انھوں نے اپنے آخری وقت میں مولینا محمد اسحاق کو مدرسہ سپرد کرکے اپنا قائم مقام بنادیا تھا۔

مصلحت کی حفاظت اور رجال اور اموال جمع کرنے کے لئے دعاۃ کا سلسلہ امام عبدالعزیز کے مدرسہ سے متعلق رہا اور عسکری اور سیاسی قیادت سید احمد شہید کی جماعت سے وابستہ ہوئی۔

سید احمد شہید معہ اپنے ہمراہیوں کے ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ کو دو سال گیارہ ماہ بعد سفرِ حج سے واپس آئے تھے، ذی الحجہ ۱۲۳۹ھ سے جہاد کی تیاری شروع کر دی گئی، مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عبدالحی نے ترغیب جہاد کے لئے اطراف ہند کا دورہ کیا۔ جب تقریباً دو ہزار مجاہدین کا اجتماع ہوگیا تو امیر شہید نے ان کے تین حصے کر دیئے، اور کوچ کا حکم دیا۔ خود کچھ عرصہ ٹونک رہ کر پہلے اجمیر شریف اور پھر دہلی آئے اور ۱۲۴۱ھ کے آغاز میں دیوبند، سہارنپور، پانی پت، کرنال، تھانیسر وغیرہ سے گزرتے ہوئے مالیر کوٹلہ پہنچے۔ وہاں سے ممدوٹ، بہاولپور، حیدرآباد سندھ، شکارپور

(بقایا نوٹ صفحہ ۹۷)

واقعات سناتے، آپ کا کوئی جلسہ مشکل اس تذکرے سے خالی ہوتا۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے مولوی حبیب ...برانوی کے ذریعہ ان کی زبانی روایات کو قلمبند کرالیا۔ اور اس مجموعہ کو امیر الروایات کے نام سے شائع ...رایا۔ بعد میں مولانا طیب صاحب متعلم دارالعلوم دیوبند کے جمع کردہ حالات مولانا رشید احمد گنگوہی ...لانا تھانوی کے ملفوظات اور بعض دوسرے اضافات کے ساتھ یہ مجموعہ ارواح ثلثہ کے نام سے شائع ... اس میں سید صاحب شاہ اسماعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب کے متعلق نہایت کارآمد ...بات کا ذخیرہ ہے۔ ؎ سیرت سید احمد ص ۲ وش ۔م ص ۳۸۹

امیر الروایات کی مذکورہ بالا حکایات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ اجتماع ایک مرکز رکھتا ...ہے ...شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ ہے، اور شاہ اسحاق اس کے رئیس تھے۔ امیر شہید چونکہ عسکری نظام کے سوا ...رہ ... زمانہ لشکر جمع کرنے کا تھا، اس لئے بیرونِ مدرسہ ان کو صدارت حاصل تھی۔

جاگن، خان گڑھ، ورڈھا ورا، درہ بولون، پشین، قندھار اور کابل سے گزرتے ہوئے براہِ خیبر پشاور آئے، پشاور سے ہشت نگر گئے اور وہاں موضع خویشگی میں قیام فرمایا، پھر نوشہرہ تشریف لے گئے، اور دوسری جماعت جو ان کے پیچھے تیار ہو رہی تھی ان کو دعاۃ کا کام سپرد کیا گیا۔

الغرض ۱۲۴۱ھ میں ہجرت شروع ہوئی اور ۱۲ جمادی الاخری ۱۲۴۲ھ (۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء) کو افغانی قبائل نے بھی "ہنڈ"[۱] کے مقام پر سید احمد شہید کو اپنا امیر مان لیا۔ اس کے بعد ایک سال تک مولانا عبدالحی زندہ رہے۔ اُن کی موجودگی میں کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوا۔ سید احمد شہید ان کے سامنے اپنی

---

[۱] ہنڈ کا تعلق ہماری سیاسی تاریخ سے نہایت قوی ہے، یہ ہنڈ وہی مقام ہے جہاں ۱۲ جمادی الاخرہ ۱۲۴۲ھ فرقہ "ولی اللہیہ" کے "مقدمۃ الجیوش" نے جسے امام عبدالعزیز دہلوی نے تیار کیا تھا، اپنی حکومت موقتہ قائم کی، اس کے رئیس امیر شہید دہلوی تھے۔ جمہور مسلمین نے بیعت کی اور انھیں امیر مان لیا گیا۔ اتفاق سے یہ تاریخ ۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء کے موافق تھی، اس لئے ہمارا شمسی قومی نوروز اس واقعہ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ۱۰ جنوری کو منایا جائے گا۔ جس قدر ہندُستانی مسلمان کی قومی روح تازہ ہوگی اسی انداز سے وہ ہماری تجویز کی تائید کریں گے۔

سر جان ایلیٹ نے لکھا ہے کہ ہنڈ دریائے سندھ کے کنارے مشہور و معروف مقام ہے، یہ اٹک سے پندرہ میل کے فاصلہ پر لاہور اور پشاور کی قدیم شاہراہ پر پشاور سے تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہنڈ شرقی قندھار کا دارالسلطنت تھا، ابو الفدار۔ البیرونی، بیہقی نے سکندر اعظم کو اس کا بانی قرار دیا ہے۔ پہلے اس کو بھنڈرہ سے یاد کیا گیا ہے۔ اب اس کو ہنڈ کہتے ہیں۔

اپنی رائے پر عمل نہیں کر سکتے تھے. بلکہ اجتماعی فیصلہ پر حکومت کا تمام تر دار و مدار تھا۔

۸ شعبان ۱۲۴۳ھ بروز یک شنبہ مولینا عبدالحی نے انتقال فرمایا۔ اس سے مجاہدین کی جماعت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا، نیز ان کی وفات کے بعد ولی اللہی تحریک میں ایک اساسی تغیر رونما ہوا۔ جس کے نتائج آگے چل کر بڑے دور رس ثابت ہوئے، اب تک اس تحریک کے پیشِ نظر یہ تھا کہ سلطنتِ دہلی کی بجائے جس کا نظام بالکل فرسودہ ہو چکا تھا امام

۱؎ سید احمد شہید ایک روز صبح کی نماز میں دوسری رکعت میں آکر شریک ہوئے. نماز سے فارغ ہو کر مولانا عبدالحی نے "مابال اقوام الخ" کے طور پر فرمایا۔ کہ ایسے لوگ جو سنت کے احیار کے مدعی ہیں۔ وہ جماعت میں بھی۔ صحیح طور پر حاضر نہیں ہو سکتے۔

سید صاحب نے فرمایا۔ مولانا! آپ کا ارشاد حق ہے۔ اور ہم سے پھر ایسی کوتاہی نہیں ہوگی اور یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اس طرح ٹوکیں۔ مولینا عبدالحی نے کہا کہ یہ عذر صحیح نہیں ہے آپ کو صحیح طور پر کام کرنا چاہیئے۔ ہر روز کون ٹوک سکتا ہے؟ امام بنتے ہو تو آگے بڑھ کر کام کرو۔

جب مولانا عبدالحی کا آخری وقت تھا۔ تو سید صاحب نے اُن سے فرمایا، کہ مولینا آپ کی اگر کوئی خواہش ہو تو میں اس کو پورا کردوں۔ آپ نے کہا۔ آپ اپنا قدم بڑھا کر میرے سینے پر رکھیں یہی ایک خواہش باقی ہے، سید صاحب نے اس کی تعمیل کر دی، الغرض ادب بھی انتہا درجے کا ملحوظ ہے۔ اور ان کو قاعدے کے اندر پابند رکھنے کی بھی قوت ہے۔

یہ ہر دو واقعے ہمیں مولینا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے سنائے۔ غالباً انہوں نے مولینا محمد قاسمؒ یا مولانا رشید احمدؒ صاحب سے سُنے ہوں گے۔

ولی اللہ کے انقلابی پروگرام کو عملی شکل دی جائے۔ اسی مقصد کے خاطر شاہ ولی اللہ نے مرہٹوں کے زور کو توڑنے کے لئے احمد شاہ ابدالی کو بلوایا تھا۔ اور اسی طرح شاہ عبد العزیز اب یہ چاہتے تھے کہ سکھوں کے خلاف جو پنجاب پر قابض تھے افغانوں سے مدد لی جائے۔ اور پنجاب... اس باغی حکومت کو ختم کرکے کابل اور دہلی کا پھر سے اتصال قائم کرد... کیونکہ مستقبل کی ترقی کا سارا انحصار اسی پر تھا۔ چنانچہ اسی مقصد کو پ... کرنے کے لئے یہ ساری جد و جہد کی جارہی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ولی اللہی تحریک کا دہلی اور ہندوستان سے... تعلق تھا، اور ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کے اصولوں پر حکومت قائم کرنا حزب ولی اللہ کے بنیادی اصولوں میں داخل تھا۔ چنانچہ د... کو اس تحریک میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اور سید صاحب اور ان کی مجاہدین کی جماعت دہلی ہی کے مرکز کی تابع تھی، اور ان کو روپیہ اور آدمی بھی دہلی سے بھیجے جاتے تھے۔ لیکن مولینا عبد الحی کے انتقال کے بعد ولی اللہی تحریک کی اس خصوصیت میں فرق آگیا، اور دہلی سے سرکشی اور بغاوت کے آثار پید ہونے لگے۔ اور دریائے سندھ سے ادھر جو... وقتہ حکومت بنی تھی وہ ایک مستقل مرکز کی حیثیت اختیار کرکے دہلی کی حریف بننے لگی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ حزب ولی اللہ کا جو طریقۂ حکومت تھا وہ بدل گیا، اور بورڈ کی امارت کی جگہ شخصی امامت (ڈکٹیٹر شپ) نے لے لی۔ اور سید احمد شہید امیر المومنین اور دنیائے اسلام کے مصلح خلیفہ مانے جانے

لگے۔ اب وہ ساری دنیا کے ایک بڑے امیر بن گئے، چنانچہ اگر افغانی سرداروں کے لئے ان کی اطاعت مذہبی فرض تھی۔ تو بخارا، ترکی اور دوسرے ممالک بھی ان کی اطاعت سے سبکدوش نہیں ہو سکتے تھے مختصراً ان کو تسلیم کرنا سب کا مذہبی فریضہ بن گیا اور اس سے مرکز یعنی ... کی حکومت جاتی رہی۔

اس اساسی تغیر سے یہ ہوا کہ حزب ولی اللہ کی خصوصیات پر زور دیا جاتا، بلکہ نجدی اور یمنی طریقوں پر کام کرنے والے ہندوستانی حنفی فقہ کی پابندی بھی اپنے لئے ضروری نہ سمجھتے۔ اس کی وجہ سے افغانوں کی ان مجاہدین سے مذہبی عداوت ہو گئی۔ امیر سید احمد شہید ... بارہا علماء افاغنہ اور عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ امیر اور ان کا خاندان ہمیشہ محققین حنفیہ کے طریقہ کا پابند رہا ہے۔ مگر یہ لوگ تھے کہ حزب ولی اللہ کی امتیازی خصوصیات کی پابندی کو قبول نہ کرتے اور اس طرح معاملہ روز بروز بگڑتا چلا گیا۔

ولی اللہی تحریک کے اس دور میں اس مسئلہ نے بڑی خطرناک شکل اختیار کر لی تھی، اور اس بناء پر اس تحریک کو ایک طرف افغانوں میں اور دوسری طرف عوام ہندوستانی مسلمانوں میں بھی بڑے زوروں سے بدنام کیا گیا۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے کچھ تفصیل کی ضرورت ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ امام ولی اللہ اگرچہ اپنے والد کی طرح حنفی مذہب

لہ ہمارے خیال میں اس تغیر میں کمپنی بہادر کی ڈپلومیٹک چال کو بڑا دخل ہے۔

کے پابند تھے۔ مگر وہ حنفی اور شافعی دونوں مذہبوں کی کتابیں محققین کی طرح پڑھاتے تھے۔ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں اپنے اصول حکمت کے مطابق حدیث کی شرح لکھی ہے۔ اس میں بعض اوقات وہ شافعی مذہب کو اگر وہ حدیث اور حکمت سے زیادہ مطابق ہوتا راجح قرار دیتے ہیں۔

حنفی فقہ کے متعلق شاہ ولی اللہ کا اپنا مسلک بالکل صاف اور واضح ہے۔ "انفاس العارفین" میں وہ اپنے والد کے متعلق فرماتے ہیں "یہ بات مخفی نہ رہے کہ حضرت اکثر امور میں حنفی مذہب کے مطابق عمل فرماتے تھے۔ سوائے چند ایک چیزوں کے، جن میں وہ حدیث یا اپنے وجدان کی بنا پر دوسرے مذہب کو ترجیح دیتے۔ ان میں سے ایک امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہے۔"

اپنی دوسری کتاب "فیوض الحرمین" میں ارشاد ہوتا ہے۔ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں توجہ کی۔ اور انؐ سے یہ معلوم کرنا چاہا کہ وہؐ مذاہب فقہ میں سے کس مذہب کی طرف زیادہ میلان رکھتے ہیں تاکہ میں اس کو مضبوطی سے پکڑوں۔ چنانچہ مجھ پر یہ کھُلا کہ ان کے نزدیک سب کے سب مذاہب برابر ہیں اور ان کی روح اقدس کو اس حالت میں فروعات کے معلوم کرنے کا خیال نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حنفی مذہب کا ایک ایسا عمدہ طریقہ بتایا جو اُن حدیثوں سے جن کو بخاری اور ان کے ساتھیوں نے جمع کیا اور ان کی جانچ پڑتال کی زیادہ قریب اور موافق ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف

اور امام محمدؒ ان تینوں کے اقوال میں سے وہ قول قبول کیا جائے جو حدیث سے زیادہ قریب ہو۔ اور ان کے بعد حنفی فقہاء میں سے ان کی بات تسلیم کی جائے جو فقہ کے ساتھ ساتھ حدیث کے بھی عالم ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مسئلہ میں امام ابو حنیفہ اور ان کے دونوں ساتھی خاموش رہے ہوں اور حدیث نے اس مسئلہ کی صراحت کر دی ہو تو اس حالت میں ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو قبول کر لیا جائے، اور یہ بھی مذہب حنفی میں شامل ہے۔"

اسی کتاب کے صفحہ ۶۲ پر فرماتے ہیں:۔ "پھر مجھ پر ایک اور فیضان ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ اللہ تعالےٰ کی مرضی یہ ہے کہ تمہارے ذریعہ امت مرحومہ کے شیرازہ کو جمع کرے۔ اس لئے تمہیں چاہیئے کہ فروعات میں اپنی قوم کی کبھی مخالفت نہ کرو۔ اگر تم اس طرح مخالفت کرو گے تو گویا اللہ تعالےٰ کی مرضی کے خلاف[1] جاؤ گے۔"

امام ولی اللہ کی دینی دعوت اور حکیمانہ فکر کے متعلق یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ جہاں تک ذہنی اعتبار سے ان کی تعلیمات و افکار کا سوال ہے ان کا مخاطب انسانیت کا اعلیٰ طبقہ ہے، اور چونکہ وہ تمام دنیا میں

---

[1] مولٰنا محمد فاخر الہ آبادی ایک دفعہ دہلی تشریف لائے۔ شاہ ولی اللہ صاحب سے ملاقات کرنا مقصد تھا۔ اتفاقاً ایک مسجد میں نماز پڑھی اور رفع یدین کر بیٹھے۔ عوام ان کے سر ہو گئے۔ نزع نے نازک صورت اختیار کر لی۔ ہجوم ان کو شاہ صاحب کی خدمت میں لے آیا۔ آپ نے برافروختہ ہجوم سے نہایت نرمی سے فرمایا۔ کہ احادیث صحیحہ میں اس طرح بھی وارد ہے۔ اس پر وہ خاموش ہو کر چلے گئے۔ بعد از آں شاہ صاحب نے مولٰنا سے فرمایا کہ حکیم وہ نہیں جو عوام کو خواہ مخواہ اپنے خلاف کرے۔

ایک ہی رنگ رکھتا ہے، اس لئے شاہ ولی اللہ کی باتیں دوسرے ممالک والے بھی اس طرح مان سکتے ہیں۔ جیسے ہندوستان والے۔ لیکن شاہ ولی اللہ نے عملی طور پر اپنی اس عمومی دعوت کو ہندوستان کے لئے خاص کر دیا تھا۔ اور اسی لئے وہ حجاز چھوڑ کر ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ ظاہر ہے ہندوستان میں حنفی فقہ کی پابندی ایک حد تک ضروری تھی، امام ولی اللہ کے بعد شاہ عبدالعزیز نے خاص طور پر اپنے ملک کے متوسط طبقے اور عوام کو مخاطب بنایا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس طرح امام ولی اللہ کے علوم ان کے ذہنوں میں راسخ کر دیں۔ اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ فقہ حنفی اور فقہ شافعی کو مساوی درجہ دیتے ہیں۔ اور شاہ عبدالعزیز فقہ حنفی سے آگے نہیں بڑھتے۔ لیکن یہ قید صرف مخاطبین کی ضرورت کی وجہ سے تھی، ورنہ جہاں تک ان کی اپنی طبیعت، نیز خصوصی ماحول مثلاً خاندان اور خاص تلامذہ کا تعلق تھا وہ علمی طور پر اپنے فکر کی بلند سطح سے نیچے اُترنے پر مجبور نہ تھے۔ لیکن ضرورت تھی متوسط طبقہ کو سمجھانے کی، اور ہر ملک کا متوسط طبقہ جدا ہوتا ہے۔ اس لئے شاہ عبدالعزیز کے طریقہ میں ملک کے متوسط طبقے کی خصوصیات کا آنا لازمی تھا۔

حنفی فقہ اور فروعات کے معاملہ میں قومی روایات کے متعلق حزب ولی اللہ کا یہ مسلک تھا۔ جب مولٰینا محمد اسماعیل شہید نے حجۃ اللہ امام عبدالعزیز سے پڑھی، تو اپنے جدامجد شاہ ولی اللہ کے طریقہ پر عمل کرنا شروع کیا، انہوں نے اپنی ایک خاص جماعت بھی تیار کی جو حجۃ اللہ البالغہ

پر عمل کرے، یہ لوگ شافعیہ کی طرح "رفع یدین" اور "آمین بالجہر" کرتے تھے جیسا کہ سنن میں مروی ہے۔ اس سے دہلی کے عوام میں شورش پھیلتی رہی، مگر حزب ولی اللہ کا کوئی عالم مولینا اسماعیل شہید اور اُن کی جماعت پر معترض نہ ہو سکتا تھا۔ بعد میں جب افغانی علاقہ میں ہجرت کا فیصلہ ہوا تو امیر شہید نے مولینا اسماعیل سے دریافت کیا کہ مولینا! آپ "رفع یدین" کیوں کرتے ہیں؟ مولینا نے کہا رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے۔ امیر شہید نے کہا کہ مولینا! اب رضائے الٰہی کیلئے "رفع یدین" کرنا چھوڑ دیجئے، اس کے بعد مولینا شہید کی خاص جماعت نے بھی ان کی اطاعت میں یہ اعمال چھوڑ دیئے[1]۔

مگر وہ لوگ جو نجدی اور یمنی علماء کے شاگرد تھے باز نہ آئے اور انہیں لوگوں کے بے جا اصرار نے مشکلات پیدا کر دیں۔ امیر شہید نے اُن کے رہنما کو جو مولینا محمد اسماعیل اور امام شوکانی دونوں کا شاگرد اور زیدی شیعہ تھا۔ اپنی جماعت سے نکلوا دیا مگر فساد کی آگ پھر بھی بھڑکتی رہی۔

ولی اللہی تحریک کی اِس منزل پر نجدی اور یمنی علماء کے ہندوستانی شاگردوں اور حزب ولی اللہ میں جو نزع پیدا ہوا، اس کی ایک اصولی حیثیت اور بھی تھی۔ یہ دراصل اختلاف تھا دو رجحانات میں۔ زمانۂ حال کی اصطلاح میں ایک رجحان تھا نیشنل، اور دوسرا تھا انٹرنیشنل رجحان۔

---

[1] یہ روائت امیر شاہ خاں مرحوم کی زبانی ہم تک پہنچی۔

آج کل یورپ کی سیاست میں ایک ہی تحریک کی نیشنل اور انٹرنیشنل جماعتوں کے اختلافات مرکزی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ایک ملک میں ایک نیشنل پارٹی ہوتی ہے، جو انٹرنیشنل رجحانات رکھتی ہے۔ اس کے برعکس دوسری پارٹی انٹرنیشنل نظریہ کو اپنا اولین اساس بناتی ہے۔ عام لوگ ان دونوں میں فرق نہیں کرتے۔ مگر یہ جماعتیں آپس میں کبھی مل کر کام نہیں کر سکتیں۔ بلکہ غالبؔ پارٹی مغلوب جماعت کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ الغرض یوں سمجھنا چاہیئے کہ حزب ولی اللہ ایک نیشنل پارٹی تھی جو انٹرنیشنل رجحانات رکھتی ہے، اور وہ ہندوستانی جو نجدی اور یمنی ذہنیت رکھتے ہیں، اُن

لہ روس کے اشتراکیوں میں ایک ٹروٹسکی کی جماعت تھی، جو انٹرنیشنل نظریہ رکھتی تھی۔ ٹروٹسکی۔ یہودی النسل تھا۔ اس کے مقابلہ میں سٹالن کی جماعت نیشنل پارٹی ہے۔ لیکن انٹرنیشنل میلان رکھتی ہے سٹالن خالص روسی ہے۔ چنانچہ اس کو جب موقعہ ملا تو اس نے ٹروٹسکی کی ساری جماعت کو جو عموماً یہودی تھے قتل کرا دیا۔ اسی طرح اسلام ایک انٹرنیشنل تحریک ہے، اور عربی، ترکی، ایرانی اور ہندوستانی نیشنل تحریکیں ہیں۔ ایک عرب جو اسلامی میلان رکھتا ہے، یا ایک ہندوستانی جو اتحاد اسلام کے فکر کو مانتا ہے۔ یہ تو مثال ہو گی سٹالن کی۔ اور ایک ایسا آدمی جو سوائے اتحادِ اسلام کے اور کوئی چیز نہیں مانتا جیسے یمنی نجدی تحریکوں سے متاثر ہندوستانی۔ یہ مثال ہے ٹروٹسکی کی۔ کیونکہ وہ اسلام کے علاوہ کسی اور چیز کو نہیں مانتے۔ ہندوستانیت، عربیت وغیرہ ان کے ہاں کوئی چیز نہیں ہے۔ لہذا ہر دو جماعتوں میں یعنی امام عبدالعزیز کی تربیت یافتہ جماعت اور یمنی نجدی طریقے پر چلنے والے ہندوستانیوں میں اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔

کو ایسی پارٹی سمجھنا چاہیئے جو انٹر نیشنل نقطۂ نظر کو اساس اولین قرار دیتی ہے۔ افغانی قومیں چونکہ خالص نیشنل پروگرام مانتی تھیں، وہ حزب ولی اللہ کے معتدل حصے سے تو متحد ہو سکتی تھیں، مگر انٹر نیشنل اصول کو اساس اوّل ماننے والے لوگوں کے ساتھ نہیں مل سکتی تھیں۔

فکری اعتبار سے ایک تو یہ نزاع تھا جو اسوقت ایک طرف افغانوں میں اور دوسری طرف نجدی اور رمنی ذہنیت سے متاثر ہندوستانیوں میں پیدا ہو گیا۔ لیکن عملی زندگی میں بھی اس کی وجہ سے بعض قباحتیں ظاہر ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ افغان شرفاء دوسری مسلم قوموں کے شرفاء سے رشتہ ناتہ کرنا[1] معیوب نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ہندوستانی مہاجرین اپنے ساتھ اہل وعیال تو لے نہیں گئے تھے، اس لئے جب یہ لوگ مستقل طور پر افغانی علاقہ میں رہنے لگے تو ان کی شادی بیاہ افغانوں کے ساتھ ہونے لگے، مگر خرابی یہ ہوئی کہ امیر شہید کے دعوائے خلافت کی اشاعت کرنے والے ہندوستانی اپنی حاکمانہ قوت دکھا کر بہ جبر[2] افغان لڑکیوں سے نکاح کرنے لگے۔ اس بارے

---

[1] ۱۲۴۳ھ میں امیر شہید نے ایک خاتون سے نکاح کیا جسکو سلیمان بادشاہ شاہ کاشغر نے سید صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادی ہاجرہ پیدا ہوئی۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد یہ خاتون ٹونک چلی آئیں۔ ۱۳۰۱ھ میں ٹونک میں وفات پائی۔ ش۔ م ص ۴۴۱

[2] افغان لڑکیوں سے بجبر نکاح کرنے کا واقعہ سیرت احمدیہ میں ان گول مول الفاظ میں مذکور ہے۔ ہندوستان کے عام خاندانوں کی طرح افغانستان اور سرحد میں عام رواج تھا کہ بیواؤں کا نکاح ثانی ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود نکاح میں اس قسم کی پابندیاں عائد تھیں کہ کنواری لڑکیاں بیٹھے بیٹھے عمر گزار دیتی تھیں۔ سید صاحب نے نکاح بیوگان اور دوسری بری رسموں کے قلع قمع کے لئے حکم دیا۔ اس سے بہت سے خاندان اور امراء ناراض ہوئے۔ ان کی مخالفت کے اسباب میں سے ایک یہ بھی بڑا سبب تھا۔ ص ۱۸۹

ہیں بھی زیادہ مجرم وہی ہیں، جو حزب ولی اللہ کے تربیت یافتہ سپاہی نہیں تھے۔ یہ لوگ مذہبی جوش میں اپنے عقیدہ وفکر کے مقابلہ میں امیر کی اطاعت بھی نہیں کرتے تھے، ان لوگوں نے لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ (جس حکم سے خالق کی نافرمانی ہوتی ہو اس کے بارے میں کسی مخلوق کی اطاعت نہ کرنی چاہیئے) کا اصول[1] غلط طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ان کی مثال یورپ کے انارکسٹوں کی سی تھی۔ جو انقلابی جماعت کے ساتھ شریک تو ہو جاتے ہیں، لیکن ان سے انقلابیوں کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جس دن سید احمد شہید افغانوں کے امیر بنے اُس کے ساتھ ہی بغاوت کی چنگاری اس اجتماع میں بھڑک اُٹھی۔ اگر معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ہم افغانوں کا امیر ایک افغان کو بناتے۔ اور یہ افغان امیر شہید کے بورڈ کا ایک ممبر مقرر کر دیا جاتا۔ اس طرح دونوں قومیں مل کر جہاد کرتیں، اور آپس میں مخاصمت پیدا نہ ہوتی۔ ہم نے اپنے اس فکر کا خود عملی تجربہ کر کے دیکھا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس سے وہ تمام فسادات رک جاتے، جو امیر شہید کی جماعت کے لئے سوہان روح بنے رہے۔ کابل میں جب ہم افغانی حکومت کے اندر رہ کر کام کرتے تھے تو ہمارے دست وبازو ہندوستانی اور افغانی دونوں قوموں کے تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔ ہم نے ان میں اس طرح کے اختلافات پیدا ہوتے دیکھے، جیسے امیر شہید کے لشکر میں پیدا ہو چکے تھے، ہم نے ان کا انسداد اس طرح کیا کہ

[1] حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے مذاق کے مخالف کوئی حکم بھی ہو، اسکو نہیں مانتے، خواہ وہ حکم امیر ہی کیوں نہ دے۔

افغانوں پر کسی غیر افغان کو سردار بننے نہ دیا۔ لیکن ان کی تمام ضرورتوں میں ان کے معاون رہے ۔ ہم نے ان پر حکومت نہ کی، البتہ ان کی امداد کرتے رہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے سارے معاملات درست[1] رہ سکے۔

سنہ ۱۲۴۲ھ ۱۲ جمادی الثانی کو سید احمد شہید کے ہاتھ پر امامت اور خلافت کی بیعت ہوئی۔ اور آپ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اعلان امامت کے چند روز بعد سرداران پشاور لشکر اور توپ خانہ لے کر نوشہرہ کے قریب "سرمائی" مقام پر سکھوں کے خلاف جہاد کرنے کے لئے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اس وقت سردارانِ پشاور سرداران سمہ اور مجاہدین ہند کی مجموعی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔ جو امیر شہید کے حکم پر ہر قربانی کرنے کو تیار رہتی۔ سردارانِ پشاور گو بظاہر سید صاحب کے ہمراہ تھے، مگر اپنی امامت کو اپنی سرداری کے لئے پیام مرگ سمجھتے تھے، اس بنا پر وہ سکھوں سے بھی ساز باز رکھتے تھے، تا کہ سرداری بہر حال باقی رہ سکے، عین اسوقت جب کہ میدانِ کارزار گرم ہونے والا تھا، اور صفیں آراستہ ہو چکیں تھیں، مولینا اسماعیل سید صاحب کو لینے کے لئے خیمہ میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سید صاحب بیہوش پڑے ہیں، اور قے جاری ہے، بظاہر یہ زہر کا اثر معلوم ہوتا تھا جو قے کے ساتھ خارج ہو رہا تھا۔ ادھر جب لڑائی شروع ہوئی تو سردارانِ پشاور

---

[1] یہ یاد رہے کہ جب ہم ہندوستان سے نکلے تھے تو اتحادِ اسلام کے حامی تھے، یعنی انٹرنیشنل پروگرام رکھتے تھے۔ مگر جب ہم واپس آئے تو اس وقت خالص نیشنلسٹ تھے۔ یہ سبق ہمیں کابل کی زندگی نے سکھایا ہے۔

کے جو دستے پہاڑیوں سے سکھوں پر بندوقوں اور توپوں سے فائر کر رہے تھے، افسوس کہ ان میں خالی بارود بھری جاتی تھی۔ سید صاحب گو میدانِ جنگ میں گئے مگر اس سے آپ پر آٹھ روز تک بیہوشی طاری رہی، سازش کے متعلق جب تفتیش شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ زہر کھلانے والے ولی محمد اور نذر محمد کشمیری شیعہ تھے جو یار محمد خاں سردار پشاور کے نوکر تھے۔ اور کھانا پکانے کے لئے یار محمد نے ان کو امیر شہید کے پاس بھیجا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کھچڑی اور گنڈیریوں میں زہر ملا کر عین جنگ کے وقت کھلا دیا امیر شہید نے گرفتاری کے بعد ہر دو مجرموں کو معاف کر دیا، سردارانِ پشاور کی غداری کے بعد آپ نے تبلیغ و تالیفِ قلوب کا سلسلہ وسیع کر دیا، تاکہ قلوب کو مائل کیا جا سکے۔ چنانچہ آپ نے مع فوج علاقہ سبز سوات وغیرہ کا دورہ کیا[۱]۔"

اِن فتنوں کے باوجود سکھوں سے لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اور مجاہدین کو افغانوں سے بھی لڑنا پڑا۔ ڈنگہ کے مقام پر مولینا شہید کی قیادت میں ہری سنگھ نلوہ کی فوج پر شبخون مارا گیا جس میں تین سو سکھ اور سات مجاہد کام آئے۔ بعد ازاں جنگ شنگاری واقعہ ہوئی، مجاہدین ڈنگہ جب روانہ ہو چکے اور ابھی باقی ماندہ حضرات کھانے پینے میں مصروف تھے کہ سکھوں کے بڑے لشکر نے حملہ کر دیا۔ حضرت شہید نے بارہ آدمیوں کو لے کر اُن پر حملہ کیا۔ جس میں تقریباً سو سکھ مارے گئے، اور یہ بارہ آدمی سلامت

---

[۱] ش، م۔ ص ۲۳۲

رہے۔ البتہ مولینا شہید کی انگلی پر گولی لگی۔[1]

بدقسمتی سے سرداران پشاور کا جذبۂ عناد بڑھتا ہی گیا۔ چنانچہ وہ چار ہزار فوج اور دو توپیں لے کر دریائے لنڈا کو عبور کر بمقام اتمان زئی آپہنچے، امیر شہید بمقام خار قیام فرما تھے، سید صاحب نے ارباب بہرام خاں، ارباب جمعہ خاں وغیرہ خوانین اور سمہ وسوات کے سرداروں سے مشورہ کرکے دو جانب سے سرداران پشاور کے لشکر پر شبخون مارا۔ غنیم کو شکست ہوئی اس کے علاوہ خادی خاں کی بغاوت، انٹورا فرانسیسی کی جنگ جسے سکھوں نے فوج کی کمان دے کر بھیجا اور رائس نے شکست کھائی، اور شبخون ہنڈ جس میں خادی خاں گولی کا نشانہ بنا وغیرہ اور واقعات رونما ہوئے۔

خادی خاں کے قتل کے بعد اس کے بھائی امیر خاں نے اندرونی طور پر سرداران پشاور (یار محمد خاں وغیرہ) سے سازباز شروع کردی مگر بظاہر وہ سید صاحب کی خدمت میں حاضر رہتا تھا، یار محمد خاں نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر امیر خاں کی ریاست میں اپنے لشکر جمع کرنا شروع کردیئے، بعدہٗ ایک لشکر لئے معہ چھ عدد توپ، ہاتھی اور اونٹ، نہایت کروفر سے خود بھی میدان میں آپہنچا، اور اعلانِ جنگ کردیا۔ ۱۵ ربیع الاوّل ۱۲۴۵ھ کو بروز دوشنبہ یار محمد خاں کا لشکر زیدہ پہنچا، مولینا محمد اسماعیل نے

---

[1] ش۔م ص ۲۲۲

جانبازوں کا لشکر لیکر یکایک حملہ کردیا۔ مجاہدین نے ان کی توپوں پر قبضہ کر لیا۔ اور توپچیوں کی مشکیں کس لیں۔ یار محمد خاں اس اثنا میں عالم بے خبری میں تو گرفتار حسینوں کے ساتھ عیش و طرب میں مشغول تھا۔ وہ زخمی ہوا۔ اور موضع ددڈھیر میں پہنچنے سے پہلے ہلاک ہوگیا۔ اور پشاور نہ پہنچ سکا۔

یار محمد خاں کی وفات کے بعد اس کا بھائی سلطان محمد خاں جوشِ انتقام سے اندھا ہوگیا۔ اور اس نے قلعہ ہنڈ پر قبضہ کر لیا۔ سید صاحب باوجودیکہ سکھوں سے تربیلا کے مقام پر نبرد آزما تھے۔ یہ خبر سنتے ہی ہنڈ کی طرف متوجہ ہوئے۔ سلطان محمد خاں نے سید صاحب کی آمد کا سنا تو بھاگ نکلا مگر سکھوں نے امیر خاں برادر خادی خاں کی انگیخت پر ہنڈ پر قبضہ کر لیا۔ ہوتی مردان کا خاں مسمی احمد خاں نکاح بیوگان اور دوسری غیر شرعی رسوم پر جو نکاح کے متعلق افغانوں میں رائج تھیں، سید صاحب سے ناراض تھا وہ سرداران پشاور کے پاس پہنچا اور ان کو بھڑکا کر جنگ کے لئے تیار کیا افغانوں کا یہ لشکر بڑھتے بڑھتے مہیار پہنچا[۱] ادھر سید صاحب مولینا اسماعیل وغیرہ کے ساتھ خود فوج لے کر میدان میں آئے۔ چند گھنٹے کی جنگ کے بعد پشاوری سرداروں کو شکست ہوئی، اور وہ لوگ مردوں اور زخمیوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے، مہیار کی فتح کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ پشاور کو تسخیر کیا جائے جو ان کا مرکز[۲] تھا۔

پشاور کے افغان سردار نے امیر شہید سے لڑ کر شکست کھائی۔ اس سے حزب ولی اللہ کا ایک صوبہ کی حکومت پر قبضہ ہوگیا چنانچہ امام عبد

[۱] ش۔ م ۱۵۸

کے تربیت یافتہ علماء حکومت کے مناصب پر مقرر ہوئے۔ چند دنوں میں حزب ولی اللہ نے ایسے نمونے کی حکومت قائم کر دی، جس کی نظیر دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یہ حکومت بآسانی سندھ تک وسیع ہو کر ماوراء السند کو انقلاب کا مستقل مرکز بنا دیتی۔ لیکن ہوا یہ کہ شکست خوردہ افغان خاندان امیر شہید کے پاس تائب ہو کر آیا۔ اور معافی مانگ کر اُس نے ملک واپس لینا چاہا، اس پر امیر شہید راضی ہو گئے۔ اس موقع پر جماعتِ مجاہدین کے خواص و عوام سب کے سب متفق الکلمہ تھے کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔ مولانا اسماعیل اور ہندوستانی اور افغانی اہل الرائے نے پورا زور صرف کیا کہ امیر شہید یہ غلطی نہ کریں، مگر انہوں نے کسی کی نہ مانی۔

اس خاندان نے حکومت واپس لیتے ہی افغانوں کے قومی جذبات کو اُبھار کر ایسی سازش کھڑی کی کہ ہر ہر قریہ کے لوگوں نے

ل‍ہ "سوانح احمدیہ" کا مصنف امیر شہید کا خاص دلدادہ ہے۔ مگر یہاں پہنچ کر اس نے واقعات نہیں چھپائے امیر شہید پر جماعت نے جس قدر زور دیا، سب کو اس نے مفصل لکھ دیا ہے۔ بہرام خاں افغان مہمند تھا! اس نے امیر شہید سے کہا کہ اگر آپ حکومت نہیں چلا سکتے تو مجھے امیر بنا دیجیئے۔ میں اپنی قوم کے زور سے اس خاندان سے لڑوں گا اور مجاہدین کے کام کے لئے آپ جس قدر امداد میرے ذمہ لگائینگے، میں اسکو پورا کروں گا، بہرام خاں نہایت مخلص شخص تھا، اور اپنی قومی طاقت رکھتا تھا، اور مولٰینا شہید کا خاص رفیق اور دلی دوست تھا۔ بقول مؤلف سوانح احمدیہ، امیر شہید نے اسکی بھی نہ سُنی، اول تو افغانوں سے ہرگز لڑنا نہیں چاہیے تھا، اور جب لڑ کر مرکز فتح کر لیا تھا تو واپس دینا بہر صورت غلط تھا۔ یہ ایسی غلطی ہے کہ کوئی اہل الرائے اس کو معاف نہیں کر سکتا۔

ایک ہی رات میں انقلابی حکومت کے تمام سرداروں اور سپاہیوں کو تہ تیغ کرڈالا۔ کابل کے قیام کے زمانے میں ہم نے اس فتنہ کے متعلق کافی معلومات حاصل کرلی ہیں، اس کی ابتدا ر خویشگی کے اس خان سے ہوئی جس کی لڑکی کا جبراً نکاح ہوا تھا۔ اس میں زیادہ رہنمائی کرنے والا خٹک کا خان تھا جس سے خویشگی خاں نے صلح کرلی تھی واقعات یوں ہیں کہ ان ہر دو خوانین کی باہمی پشتینی دشمنی تھی ۔ جب خویشگی کے خان کی لڑکی کا ایک ہندوستانی کے ساتھ جبراً نکاح کیا گیا تو اس نے خانِ خٹک سے کہا کہ میں نے اب اپنا دعویٰ چھوڑ دیا ہے ۔ اب سوال ننگ افغانی کا ہے، ہماری اب باہمی صلح ہے، تم میری مدد کرو۔ خان خٹک کی نوجوان لڑکی تھی، یہ پیغام پہنچتے ہی اس نے اپنی دوشیزہ لڑکی کو مجلس میں بلایا اور سر دربار اس کے سر سے کپڑا اتار دیا۔ اور کہا آج سے تیری کوئی عزت باقی نہیں رہی ۔ جب تک اُس افغان لڑکی کا انتقام نہیں لیا جاتا، تیری عزت ہیچ ہے اس کے بعد خان خٹک کی یہ لڑکی اس فتنہ کے خاتمہ تک ننگے سر رہی ۔ رات کو ایک جماعت اس کے ساتھ جاتی اور ایک گاؤں میں عورتوں اور مردوں کو جمع کرکے پشتو میں ننگ افغانی کے نام سے لوگوں کو بھڑکاتی، دوسری رات دوسرے گاؤں میں جاتی، اس طرح اس نے تمام افغانی علاقہ میں شورش برپا کردی۔ چنانچہ ایک معین رات میں امیر شہید کے تمام مقرر کردہ اہل مناصب قتل کردیئے گئے اور حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔[۱]

---

[۱] پشاوری عوام سلطان محمد خاں سردار پشاور وغیرہ کی عیاشی سے متنفر تھے، سب نے سید صاحب کو

(بقایا صفحہ ۱۱۶ پر)

امیر شہید اس واقعہ سے کہ قاضی، مفتی، حاکم، سپاہی، غرض ساری جماعت قتل کر دی گئی تھی، بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ موصوف نے اپنا فوجی مرکز کشمیر میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ بالاکوٹ راستہ کی ایک منزل تھی، یہاں سکھوں کے ولی عہد سلطنت شیر سنگھ نے حملہ کر دیا۔

(بقایا نوٹ صفحہ ۱۱۵)

سر آنکھوں پر رکھا۔ سابقہ جنگوں میں شکست اور عوام کی بڑھتی ہوئی عقیدت نے سلطان محمد خاں کی ہمت پست کر دی۔ اس نے ارباب فیض اللہ خاں مہمند کے ذریعہ توبہ کی درخواست کی، جماعت کی مرضی کے خلاف آپنے یہ درخواست بعد از دیر منظور کر لی۔ اب حاکم پشاور کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا۔ اس موقع پر ارباب بہرام خاں وغیرہ نے خود اپنے لئے درخواست کی۔ مگر سید صاحب نے پشاور کی حکومت اور ولایت کا پروانہ اسکو عطا کر کے پشاور کا حاکم بنا دیا۔ سید صاحب نے مولینا سید مظہر علی کو شہر کا قاضی مقرر کیا، اور مولینا قمر الدین کو معہ چند اور حضرات کے ان کی مدد کے لئے پشاور چھوڑا۔ اب سید صاحب اور مجاہدین کی حدود حکومت سرحد کے بڑے علاقہ پر محیط ہو گئیں، اسکے بعد سلطان محمد خاں نے غداری کر کے سب سے پہلے قاضی مذکور کو مع ارباب فیض اللہ خاں کے قتل کرا دیا، یہ فیض اللہ خاں وہی ہے جس نے سلطان محمد خاں کی توبہ منظور کرائی تھی، ایک رات مجاہدین نے دیکھا کہ پہاڑیوں پر اور قریہ بقریہ اونچے مکانات پر آگ جلائی جا رہی ہے، اور عوام خوشیاں منا رہے ہیں، مجاہدین نے اس کا سبب دریافت کیا تو بتایا گیا کہ یہ سب سرکاری مالیہ کی ادائیگی کی تیاری ہے، تاکہ فصل صاف کر کے کل عشر ادا کیا جائے۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک ہی رات میں کہیں عشاء کی نماز کے وقت، کہیں نصف شب کے وقت، کہیں صبح کی نماز کے وقت تمام مجاہدین تحصیلداروں اور حکام وغیرہ کو ذبح کر دیا گیا۔ ش۔ م۔ ص۱۵۰

مجاہدین ایسے میدان میں گھر چکے تھے کہ نہ کوئی سردار باقی رہا تھا اور نہ کوئی سپاہی۔ تحقیق سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ امیر شہید کا سر کاٹ کر رنجیت سنگھ کو دکھانے کے لئے لاہور لایا گیا، اور بغیر سر کے آپ کا جنازہ مولینا محمد اسماعیل شہید کے جنازے کے ساتھ بالا کوٹ میں دفن ہوا۔

شیخ محسن نے اپنی کتاب "الیانع الجنی" میں بڑی تفصیل سے اس سانحہ کو بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں "مجاہدین کے قتل عام کے بعد سید صاحب نے ارادہ کر لیا کہ اس بدنصیب سرزمین سے ہجرت کر لی جائے اس وقت جس قدر مجاہدین موجود تھے، ان کے روبرو آپ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اب اس سرزمین کو چھوڑنا چاہتا ہوں نہیں بتا سکتا کہ کہاں جاؤں گا۔ میں آپ کو رخصت دیتا ہوں۔ آپ مجھے رخصت دیں۔ مجاہدین نے کہا ہم سب آپ کے ساتھ ہیں پر آپ نے کشمیر کی جانب کوچ کا حکم دیا۔ یہ واقعہ ماہ رجب ۱۲۴۶ھ کا ہے۔ پنجتار اور رسمہ کے مخلص عقیدت مند کئی منزل تک آپ کے ساتھ گئے۔ سید صاحب علاقہ کاغان میں پہنچے۔ وہاں سے آپ نے چار سو مجاہدین کا لشکر زیر قیادت مولینا شہید اور مولینا خیر الدین شیر کوٹی درۂ بھوگرمنگ روانہ کیا۔ یہاں شیر سنگھ بیس ہزار فوج کے ساتھ مال گذاری وصول کرنے کے لئے پڑا ہوا تھا۔ مجاہدین کا شبخون کامیاب رہا، اور وہاں کے لوگوں نے سکھوں کی بجائے مجاہدین کو مالیہ ادا کیا۔ جو ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ درۂ مذکور سے بڑھ کر مولینا اسماعیل شہید نے بالاکوٹ پر قبضہ کر لیا۔

ان ایام میں شیر سنگھ سردار نجف خاں رئیس مظفر آباد کے ساتھ پشاور گیا ہوا تھا۔ مظفر آباد سکھوں کا فوجی ہیڈ کوارٹر تھا۔

"مولینا اسماعیل شہید نے خیر الدین، ملا قطب الدین اور منصور خاں قندھاری کو فوج دے کر مظفر آباد روانہ کیا۔ خونریز جنگ کے بعد مظفر آباد فتح ہوا، شیر سنگھ کو جب اس کی اطلاع پہنچی، تو وہ گڑھی حبیب اللہ آیا جو مظفر آباد اور بالاکوٹ کے درمیان ہے۔ بالاکوٹ گویا ایک قدرتی قلعہ ہے، جس کو چاروں طرف سے بلند پہاڑیوں کی دیواروں نے گھیر رکھا ہے۔ ایک بدبخت مسلمان کی رہنمائی سے شیر سنگھ دشوار گذار دروں سے چھلانگتا ہوا ایسے مقام پر پہنچا، جہاں صرف ستر مجاہد پہرہ دے رہے تھے، ان سب کو شہید کر کے شیر سنگھ کی بیس ہزار فوج ایک محصور مقام پر ہزار بارہ سو کی جماعت سے نبرد آزما ہوتی ہے۔ نشیبی علاقہ میں مجاہدین تھے اور بلندیوں پر سکھ۔ دست بدست لڑائی کے علاوہ سکھوں کی بھاری جمعیت پہاڑوں سے گولیوں کی بارش برسا رہی تھی۔ سید صاحب، مولینا شہید، ارباب بہرام خاں اور دوسرے جانثار مجاہدین سکھوں کی فوج میں گھس گئے، اور سب نے جام شہادت نوش کیا۔ یہ واقعہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء بروز جمعہ، نماز جمعہ کے وقت کا ہے۔ شہادت کے وقت سید صاحب کی عمر ۴۶ سال کی تھی، اور مولینا شہید کی عمر ۵۳ سال تھی۔"[۱]

[۱] صفحہ ۱۷۱

حکیم الہند امام ولی اللہ نے ۵ رمئی ۱۷۳۱ء کو اپنا کام شروع کیا تھا۔ جب اس تحریک پر پورا سو برس گزر چکا، تو امام ولی اللہ کے بنیظیر پوتے اور اس کے رفقار نے شہید ہو کر تحریک کو ہمیشہ کے لئے زندہ کردیا ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

یہ واقعہ ۶ رمئی ۱۸۳۱ء کو پیش آیا، ایسٹ انڈیا کمپنی گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ مگر اب تک اس نے تجارتی لباس میں مستور رہنا ضروری سمجھا تھا۔ اس واقعہ سے دو[1] سال بعد ۱۸۳۳ء میں یہ یک لخت تجارت کا لبادہ اُتار کر حکومت کی مالک بن جاتی ہے۔ فی ذالک لعبرۃ لاولی الالباب۔

اس تحریک کے متعلق ہم نے کتاب "المسوی" کے مقدمہ میں ایک حاشیہ[2] لکھا تھا، اُسے یہاں نقل کردینا خالی از فائدہ نہ ہوگا "المسوی" کا یہ نسخہ مکہ معظمہ میں طبع ہو چکا ہے۔

"امام عبدالعزیز کی تحریک ترقی کرتے کرتے ۱۲۴۲ھ میں اس قابل ہوگئی کہ اس نے ہندوستان کی سرحد پر افغانوں کے کوہستانی علاقہ

---

[1] دو سال تک یہ لوگ اس انتظار میں رہے کہ آیا یہ تحریک پھر اٹھتی ہے یا نہیں؟ جب دیکھا کہ تحریک قطعاً ختم ہو چکی ہے تو انہوں نے اپنی حکومت کا اعلان کردیا۔

[2] اصل عبارت عربی میں تھی۔

میں اپنی مؤقتہ حکومت قائم کر لی، اس حکومت شرعی کی قیادت امیر المومنین سید احمد دہلوی (امیر شہید) کے سپرد ہوئی، اور صدر الوزراء مولانا عبد الحی دہلوی (صدر سعید) بنے اور جنگی اور سیاسی امور مولانا محمد اسماعیل دہلوی (صدر شہید) کی تحویل میں تھے، باقی رہا امور داخلیہ مثلاً اموال کی فراہمی اور مجاہدین کی روانگی وغیرہ، ان کا مرکز دہلی تھا، اور مولانا محمد اسحاق (صدر حمید) اس کے نگران تھے۔ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۱۰ مئی ۱۸۳۱ء)[1] کو بالاکوٹ کے مقام پر جو کشمیر کی حدود کے قریب واقع ہے۔ امیر اور ان کے ساتھی شہید ہو گئے۔ راقم عبید اللہ بن اسلام سندھی دیوبندی وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ہمارے نزدیک سرحد پار کی حکومت مؤقتہ کا قیام دراصل امام عبد العزیز ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا۔ سید صاحب کو بڑی کشف وکرامت کا مالک بنا کر ساری جماعت کا امام منوایا گیا ہے۔ یہ چیز حقیقت کے سراسر خلاف ہے۔ یہاں کشف وکرامت کا مذکور ہی کیا ہے، اصل امام عبد العزیز تھے۔ سید صاحب امام عبد العزیز کی جماعت کے سپاہی تھے۔ وہ فوجی جرنیل کے فرائض اچھی طرح ادا کر سکتے تھے۔ اُن سے غلطی ہوئی، خدا تعالیٰ انہیں معاف کرے۔ ہم مدت سے اصل شاہ عبد العزیز کو مانتے ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ سید صاحب کی بزرگی میں مولانا عبد الحی اور مولانا محمد اسماعیل کا اشتراک ہے؟ کیا ان کو سید صاحب نے تیار کیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ یہ لوگ تو امام

---

[1] ہجری مہینہ کی تاریخ محفوظ ہے، انگریزی جنتری کے ساتھ تطبیق دے کر پہلے ہم ۱۰ مئی کرتے تھے، مگر دوسری جنتریوں کی مدد سے ۶ مئی معین ہوتی ہے۔

عبدالعزیز کے تربیت یافتہ تھے۔ سید صاحب کو روپیہ شاہ اسحٰاق صاحب بھیجتے تھے۔ کیا ان کو سید صاحب نے تیار کیا تھا؟ یہ سارا کام امام عبدالعزیز کا تھا۔ انھوں نے آدمی تیار کئے۔ پروگرام بنایا اور کام شروع کیا۔ پھر غلطیاں اس قدر ہوئیں کہ ان کا لازمی نتیجہ شکست تھا۔ پہلے زمانہ میں ہم یہاں پہنچ کر رو دیتے اور زمانے کی شکایتیں کرتے کہ لوگ اسلام سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ مگر یورپ کی انقلابی تحریکوں کی تاریخ پڑھنے سے ہمارے تمام خدشات رفع ہو گئے۔ اس طرح کی انقلابی تحریکیں بار بار شکست کھاتی

---

[1] تحریک کے دعاۃ کا نظام شروع سے آخر تک مولٰینا اسحاق کے ہاتھ میں رہا ہے۔ "سوانح احمدیہ" کے مصنف نے امیر شہید کے مناقب اس طرح بڑھا چڑھا کر لکھے ہیں کہ مولٰینا اسحاق کی شخصیت گم ہو گئی ہے۔ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ مولٰینا ولایت علی نے مولٰینا اسحاق کے بالمقابل اپنی پارٹی بنائی اور سوانح احمدیہ کا مصنف اس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر پھر بھی اس کے قلم سے بعض واقعات ایسے نکل گئے ہیں جن سے ہمارے مطلب پر روشنی پڑتی ہے۔ مولٰینا محمد اسحاق نے ایک ہنڈی پنچ تار بھیجی۔ وہاں وہ وصول نہ ہو سکی، اسکی بازیافت کے لئے سیٹھ پر عدالت عالیہ آگرہ میں دعویٰ کیا گیا، اور ڈگری مولٰینا محمد اسحاق کے نام ملی (مؤلف) سوانح احمدیہ نے یہ واقعہ اس لئے لکھا کہ یہ تحریک برطانوی گورنمنٹ کے خلاف نہ تھی۔ براہ دور اندیشی شیخ غلام علی رئیس اعظم الٰہ آباد کی معرفت گورنر اضلاع شمالی و مغربی کو اس تیاریٔ جہاد کی اطلاع دی گئی۔ جس کے جواب میں گورنر نے کہا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری سے مانع نہیں۔ مذکورہ بالا واقعہ سوانح احمدیہ میں موجود ہے۔ ہم اس ایک واقعہ کو کافی سمجھتے ہیں۔ اگر روپیہ روانہ کرنے کا انتظام شاہ اسحاق کے ہاتھ میں نہ ہوتا، تو عدالت میں وہ دعوے کس طرح کر سکتے تھے اور ڈگری کس طرح لے سکتے تھے۔

ایک واقعہ اور ہے۔ مولٰینا محبوب علی مجاہدین کے مرکز سے دہلی واپس آئے تو انہوں نے اس تحریک

بقایا صفحہ ۱۲۲ پر دیکھئے

ہیں تب جا کر کہیں برگ و بار لاتی ہیں، اور اپنے مقام پر پہنچتی ہیں۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ واقعہ بالاکوٹ پر امام ولی اللہ اور امام عبدالعزیز کی اجتماعی تحریک کا ایک دور ختم ہو گیا۔ لیکن چالاک تاریخ نویس اس واقعہ کو خود تحریک کا خاتمہ قرار دیتا ہے۔ وہ پہلے امیر شہید کی عظمت پر زور دے کر ان کو ساری تحریک کا ماں باپ ثابت کرتا ہے۔ اس کے خیال میں اس تحریک کی اس قدر کامیابی میں نہ امام عبدالعزیز کا دخل تھا اور نہ امام ولی اللہ کا۔ اور نہ پشاور کی حکومت مؤقتہ کو دہلی میں مولینا محمد اسحاق کی امامت یا صدارت سے جو روپیہ اور مجاہدین پہنچانے کی ذمہ دار تھی، کوئی تعلق تھا۔ اس کے بعد وہ آسانی سے امیر سید احمد کی شہادت سے اس تحریک کے ختم ہونے کا نتیجہ نکال لیتے ہیں۔

(بقایا نوٹ صفحہ ۱۲۱)

کے خلاف پروپگنڈا کرنا شروع کر دیا۔ کہ یہ تحریک جہاد سرے سے بے سود اور غلط اقدام ہے وغیرہ وغیرہ۔ سوانح احمدیہ کا مصنف لکھتا ہے کہ مولینا محمد اسحاق اور مولینا محمد یعقوب کی کوششوں سے یہ فتنہ دبا۔ اور وہ اثر باطل ہوا، اور قافلوں کی روانگی باقاعدہ شروع ہو گئی۔

لہ سوشلسٹ انقلابی تحریک سب سے پہلے فرانسیسی انقلاب کے موقع پر شروع ہوئی، اور ٹوٹ گئی۔ پھر دوسری بار منظم ہوئی اور شکست کھا گئی، بعد ازاں روس میں لینن نے اسکو تیسری بار منظم کیا اور اس کا نام اسی مناسبت سے تھرڈ انٹرنیشنل تجویز ہوا۔ کارل مارکس کے اصل نظام اور لینن کے موجودہ نظام میں بہت کچھ تبدیلی آچکی ہے۔ مگر وہی تحریک اپنے تیسرے دور میں کامیاب ہو کر رہی۔ اور زمین کے ایک بڑے قطعہ پر اپنی حکومت قائم کر سکی۔

لہ ہم ولی اللہی تحریک کے اس سلسلہ کو زندہ ملنتے ہیں اور یہ مولینا شیخ الہند کی صحبت کا خصوصی فیض ہے۔ مولینا شیخ الہند کی صحبت میں رہ کر ہم اس تحریک کے خفیہ کاموں سے کافی واقفیت رکھتے ہیں۔

ولی اللہی تحریک کا دُوسرا دَور

(یہ دور الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق دھلوی نے سنہ ۱۲۴۶ھ میں شروع کیا اور سنہ ۱۳۳۹ھ میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی قدس سرہٗ کی وفات پر ختم ہوا)

مولانا محمد اسحاق دہلوی نے بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد گیارہ سال تک غور و فکر فرما کر امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کا نیا پروگرام مکمل کیا۔ اُن کے اس پروگرام میں دو اصول زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

(۱) حنفی مذہب کی پابندی۔

(۲) ترکی سلطنت سے اتصال

مولانا محمد اسحاق دہلوی کا یہ قطعی فیصلہ تھا کہ سب سے پہلے ولی اللہی تحریک سے اس عنصر کو پاک کر دیا جائے جو امام ولی اللہ اور امام عبدالعزیز کے اصول اور طریقہ کار کو کاملاً تسلیم نہیں کرتا۔ اس طرح حزب ولی اللہ کا نظام عرب کی یمنی اور نجدی تحریکوں سے علیحدہ ہو کر ہندوستانی مسلمانوں

کی اکثریت کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کے اہم عنصر پٹھانوں کو بھی اپنے ساتھ لے سکتا ہے۔

اس نظام کو پختہ بنانے کے لئے عوام کو بتایا گیا کہ جس قدر رہنما فقہ حنفی اور ہندوستانی تصوف کو چھوڑنے کی دعوت دیتے ہیں، وہ حقیقت میں شیعہ پارٹی کا کام کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں حزب ولی اللہ کا متوسط طبقہ ہر ایسے انسان کو جو فقہ اور تصوف کا انکار کرتا چھوٹا رافضی کہتا[1]۔ اس نظام کو اور زیادہ مستحکم بنانے کے لئے مولٰینا محمد اسحاق نے ترکی خلافت سے اشتراک ضروری سمجھا، اور وہ اپنا مرکز مکہ معظمہ[2] لے گئے۔ ظاہر ہے ان کے نزدیک اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یمنی اور نجدی تحریکیں دوبارہ معاملہ بگاڑ نہیں سکیں گی۔

مولٰینا محمد اسحاق[31] مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولٰینا محمد یعقوب[32] دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اور دہلی میں مولٰینا مملوک علی[33] کی صدارت میں مولٰینا قطب الدین[34] دہلوی، اور مولٰینا مظفر حسین[35] کاندھلوی

---

[1] شاہ اسحاق کے متبعین جس کو اس قسم کا پاتے عوام سے کہتے کہ یہ چھوٹا رافضی ہے یہ جملہ دراصل امیر شہید کا بنایا ہوا ہے، مگر کثرت سے اس کا استعمال شاہ اسحاق کے متبعین نے کیا۔

[2] امیر شہید اور مولٰینا شہید کی شہادت سے تقریباً گیارہ سال بعد ۱۲۵۸ھ میں مولٰینا محمد اسحاق اور مولٰینا محمد یعقوب (ان کے بھائی) نے متبعین اور متوسلین سمیت ہندوستان سے ہجرت کر کے حرم محترم کو اپنا نشیمن بنایا۔

اور مولینا عبد الغنیؒ دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنادیا، جو اس نئے پروگرام کی اشاعت[1] کر کے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے۔ یہی جماعت ہے جو آگے چل کر دیوبندی نظام کو چلاتی ہے۔ الغرض امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کو اس نہج پر ڈالنے میں شاہ محمد اسحاق کی اصابت رائے کا نتیجہ تھا کہ بعد میں دہلی کے مدرسہ کے نمونہ پر دیوبند میں جو درس گاہ قائم کی گئی اس نے پچاس سال کے عرصہ میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔

دیوبندی نظام اور اس کی سیاسی مصلحتوں کو سمجھنے کے لئے اس حقیقت کو مستحضر کرلینا چاہیئے کہ جس دیوبندی جماعت کا تعارف ہم کرانا چاہتے ہیں، وہ اس دہلوی جماعت کا دوسرا نام ہے، جو

---

[1] مولینا شاہ عبد الغنی بن ابی سعید عمری کو ہندوستان میں چھوڑا گیا، آپ کی عمر ہنوز پچیس برس کی تھی۔ تقریباً ۱۲۶۵ھ (۱۸۵۲ء) میں شیخ الاسلام مولینا محمد قاسم دیوبندی اور شیخ الاسلام مولینا رشید احمد گنگوہی نے بہ سلسلہ احادیث نبویہ شاہ عبد الغنی سے فیوض و کمالات کا اکتساب کیا، اور ان کی خدمت میں رہ کر وہ تمام برکتیں حاصل کیں جو ایک مقدس استاد سے حاصل کی جاسکتیں ہیں۔

شاہ عبد الغنی اور شاہ احمد سعید دہلی میں مولینا محمد اسحاق کی نمائندگی کرتے رہے۔ اس اثنار میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آیا۔ اور آپ ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔ ۶ محرم ۱۲۹۵ھ بعمر ساٹھ سال مدینہ طیبہ میں وفات پائی۔ س۔م صد ۵۶۳ و صد ۶۶۹، شاہ عبد الغنی کے حالات ابجد العلوم صد ۹۲۹ ملاحظہ ہوں۔

[2] (قول جلی میں) شیخ محمد عاشق سے امام ولی اللہ کا ایک الہام شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کے بارے میں مذکور ہے۔ یہاں اس پر ہم اتنا اضافہ کرتے ہیں کی سیاسی تحریک جو انکی اولاد ذکور کے ہاتھ تھی اس کا سلسلہ مولینا شہید کی شہادت پر ختم ہوجاتا ہے۔ اس سے انکو الہام ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ پھر انکی اولاد اناث سے شروع ہوگا جیسے امام ولی اللہ نے کام حجاز سے شروع کیا، اور ہندوستان آکر اس کی تکمیل میں لگ گئے۔ یہ نیا سلسلہ بھی اسی طرح کام کرنے کے لئے حجاز ہی سے اقدام کرے گا۔

مولانا محمد اسحاق کی ہجرت کے بعد ان کے متبعین نے اُن کی مالی اعانت اور ان کے افکار کی اشاعت کے لئے بنائی تھی. اس جماعت کی صدارت سب سے پہلے استاد اساتذہ الہند مولانا مملوک علی صدر مدرس دہلی کالج کے لئے مخصوص رہی ان کے بعد مولانا اسحاق نے مولانا امداد اللہ کو اس کام کے لئے مقرر کیا. مولانا محمد اسحاق نے مکہ معظمہ پہنچ کر پوری آزادی سے اپنی ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کا کام شروع کر دیا تھا، اس پر دولت عثمانیہ کی وزارت خارجیہ کو اُن کے اخراج پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی، اس بیرونی دباؤ کے مخمصہ[1] سے نجات حاصل کرنے کے لئے مولانا محمد اسحاق نے شیخ الحرم کو واسطہ بنایا، اور ایک پناہ گیر کے طور پر حجاز میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی اس اجازت کی شروط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مولانا محمد اسحاق

---

[1] حضرت سید صاحب اور مولانا شہید نے ۱۲۳۸ھ و ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۶ء و ۱۸۲۷ء یعنی ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک حجاز میں قیام فرمایا. اس سے پہلے حجاز پر ترکوں کا ۱۸۱۸ء میں کامل تسلط ہو چکا تھا، مولانا شہید نے نجدیوں کے پاس اپنا آدمی بھیجا تھا، مگر وہ چونکہ حجاز میں نہیں آسکتے تھے انہوں نے نامہ بر کو واپس کر دیا کہ ہم اس وقت دعا کے سوا اور کوئی اعانت نہیں کر سکتے. یہ واقعہ مکہ معظمہ میں نجد کے ثقہ عالموں سے معلوم ہوا۔ دہلوی تحریک کو جس قدر مورخ نجدی تحریک سے ملاتے ہیں ان میں سے موافقین تو ناواقفی کا شکار ہوئے اور مخالفین نے اپنی سیاسی شرارت کے لئے اُسے وسیلہ بنایا۔

بالاکوٹ کے بعد علاوہ علمی اختلافات کے سیاسی اصول پر بھی دونوں تحریکیں نہیں مل سکتیں. نجدی اور یمنی عرب ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوست اور ترکوں کے مخالف تھے. الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق نے دولت عثمانیہ سے تعلق پیدا کر کے عربی تحریکوں سے قطعاً علیحدہ رہنا ضروری سمجھا۔

دولت عثمانیہ کی سیاسی رہنمائی پر کاملاً اعتماد کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے پیروؤں میں سے ان کی معاون دہلوی جماعت نے بھی اس فیصلہ کو قبول کر لیا۔ تاکہ انہیں اپنے کام سے ربط رکھنے میں آسانی ہو۔

یہ دہلوی جماعت اس وقت تک اپنے وطن میں کام کرتی رہی، جب تک دہلی کا شاہی اقتدار بحال رہا۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں جب اُس پرانی انقلابی تحریک کے لئے جو تعلیمی لباس میں کام کرتی رہی تھی، اپنے موطن میں اپنے وجود کو سنبھالنا ممکن نہ رہا۔ تو لامحالہ ان کو اپنا مرکز ایسے شہر میں منتقل کرنے کی ضرورت پڑی، جو انگریزی حکومت کے قانونی احاطہ میں نہ ہو۔

۱۸۵۷ء میں اس جماعت کی مرکزی قوت میں سلطان دہلی کی طرفداری اور غیر جانب داری کی بنا پر ایک اختلاف رونما ہوا۔ اور یہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ بعد میں دہلی کی بجائے دیوبند اور علی گڈھ دو مرکز بن گئے۔ مولانا محمد قاسم دہلی کالج کے عربی حصہ کو دیوبند لے گئے اور سر سید[1] احمد خاں نے دہلی کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڈھ پہنچا دیا۔ کالج پارٹی انگریزی حکومت کے ساتھ پورا اشتراک کئے بغیر

---

[1] سر سید احمد خاں استاد اساتذہ الہند مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے! ور مولانا مملوک علی نے شیخ رشید الدین سے علم حاصل کیا تھا! ور وہ شاہ عبد العزیز کے شاگرد تھے، آپ نے شاہ صاحب سے طریقہ تحریر سیکھا، اور اس میں کمال حاصل کیا۔ نیز شاہ عبد القادر اور مولانا عبد الحی سے بھی پڑھا، لیکن آپ بیشتر شاہ رفیع الدین کی خدمت میں رہے الغرض سر سید احمد دہلوی جو علی گڑھ دار العلوم کے بانی ہیں ولی اللہی ہیں۔

اپنا کام شروع نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے گورنمنٹ کی وفاداری کو اپنی سیاسی مصلحت کا جزو بنا لیا۔ مگر دیوبندی جماعت جو مولانا محمد اسحاق کے زمانہ سے دولت عثمانیہ کو اپنا سیاسی رہنما مان چکی تھی، اضطراری حالات کے سوا حکومت کی کامل وفاداری کا اعلان نہ کر سکتی تھی۔ اس نے معتدل حالات میں برطانوی سیاسی مصالح سے غیر جانب داری کو اپنا مسلک بنایا۔ لیکن طے یہ پایا کہ جب بھی دولت عثمانیہ اور دولت برطانیہ میں لڑائی ہو تو اس وقت دیوبندی جماعت کی یہ غیر جانبداری بھی قطعاً ختم کردی جائے گی۔

ہم مولانا محمود الحسن شیخ الہند کو اپنے مشائخ اربعہ۔ مولانا امداد اللہ مولانا محمد قاسم۔ مولانا محمد یعقوب دیوبندی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کا جانشین مانتے ہیں۔ ہم اٹھارہ سال تک ان کی صحبت خاصہ میں رہ کر ان کے سیاسی مسلک کو سمجھتے اور پھر اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ جس قدر ہم دیوبندی مسلک کو سمجھ سکے اس کا خلاصہ ہم نے اپنے الفاظ میں لکھ دیا ہے۔ واللہ المستعان۔

بالاکوٹ [illegible] ان کے ساتھیوں کی شہادت کے بعد امام عبدالعزیز کی مرکزی جمعیت کا کوئی رکن بجز الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلوی کے باقی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حقیقت حال سے واقف ہو کر اپنے رفقار کے ساتھ مشورہ کیا اور تحریک کی بقا کے لئے راستہ بنایا۔ اور اپنی عقل اور ہمت کے مطابق

تحریک کو اس پر چلایا۔ خدا نے ان کی کوششوں کو قبول فرمایا، اور اُن میں برکت دی۔ ان کے پیرو جیسے جیسے حالات پیش آئے، اپنے قدم آگے بڑھاتے گئے۔ اس جماعت نے تقریباً سو سال تک اس راستہ پر چلنے کی محنت برداشت کی، اور اسی کا عملی نتیجہ دیوبندی نظام کی صورت میں نکلا۔

لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ دہلی سے باہر جس قدر جماعتیں حزب ولی اللہ سے تعلق رکھتی تھیں، ان سب نے مولٰینا محمد اسحاق کی رہنمائی پر اتفاق کرلیا۔ بلکہ ہمیں یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ بالاکوٹ کی مصیبت عظمیٰ اپنے پیچھے اپنی مستقل یادگار چھوڑ گئی۔ اور وہ تھا جماعت میں انشقاق و اختلاف۔ اس کے بعد حزب ولی اللہ دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئی۔ ہم دہلوی (دیوبندی) جماعت کے حالات جس تفصیل سے جانتے ہیں، اس قدر پٹنہ یعنی صادق پور کی تحریک سے آشنا نہیں۔ بہر حال تتمیم مبحث کے لئے ہم یہاں صادق پوری جماعت کے مجمل[1] حالات بیان کرتے ہیں۔

واقعہ بالاکوٹ میں بقیۃ السیف مجاہدین کو امیر شہید کا جنازہ نہ ملا۔ بات یہ ہوئی کہ سکھوں نے امیر شہید کا سر کاٹنے کے بعد مقامی مسلمانوں کی معرفت فوجی اعزاز کے ساتھ آپ کو دفن کرا دیا۔ چونکہ مجاہدین کے فکر سے شکست فاش کا تصور کوسوں دُور تھا۔ اس لئے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ

حالت اضطراب میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہو، امیر کہیں غائب[1] ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض اتفاقی واقعات بھی اس کے مؤید بن گئے۔ امیر شہید نے بالاکوٹ کے واقعہ سے چند روز پیشتر اپنے اصحاب کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ اگر بالفرض کسی ضرورت کے لئے ہم چند روز غائب ہو جائیں تو آپ لوگ مایوس نہ ہوں، بلکہ اپنے کام پر مستقل طور پر قائم رہیں۔ درحقیقت وہ ان اشاروں اور کنایوں سے پیش آنے والے واقعات کے لئے ذہنوں کو تیار کر رہے تھے، مگر پریشان دماغی اس قدر سوچنے کا کب موقعہ دیتی ہے اس طرح یہ روائت کہ امیر کہیں غائب ہو گئے ہیں، پیدا ہو گئی۔ اور مخالفوں نے اسے سارے ہندوستان میں پھیلا دیا تاکہ تحریک اپنے عمل کے اعتبار سے ختم ہو جائے۔

پٹنہ کے مولینا ولایت علی مرحوم معرکۂ بالاکوٹ میں موجود نہ تھے۔ موصوف مولینا اسماعیل شہید کی اس جماعت کے خاص رکن تھے، جو مولینا شہید نے حجۃ اللہ پڑھنے کے بعد اس پر عمل کرنے والی ایک جماعت بنائی تھی۔ یہ لوگ رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرتے۔ لیکن ہجرت کے

---

[1] سکھوں کا رسالہ جنازہ کے ساتھ تھا، شیر سنگھ نے اپنا خاص دوشالہ جنازہ پر ڈالنے کے لئے بھیجا، اور مقامی ملاؤں سے جنازہ کی نماز پڑھوائی، اور فوجی اعزاز کے ساتھ انہیں دفن کرایا۔ لیکن مجاہدین اس وقت سخت پریشانی اور آشفتہ دماغی کا شکار ہو رہے تھے۔ کیونکہ امیر مع اپنے معتمدین کے شہید ہو چکے تھے۔ اس لئے اگر ان کو اس اعزاز اور دفن کا واقعہ معلوم نہ ہو تو چنداں بعید نہیں۔

موقعہ پر امیر شہید کے سمجھانے سے مصلحت عامہ کے پیش نظر اس جماعت کو ختم کر دیا تھا۔ چنانچہ اب مولٰینا ولایت علی نے اس جماعت کے احیار کو اپنا مقصد بنایا۔ اور آپ نے مولٰینا محمد اسحاق کے اصلاحی[1] فکر کو قبول نہ کیا۔

مولٰینا ولایت علی نے امیر شہید کے غائب ہونے کی روائت کی آڑ میں اپنی مستقل جماعت بنانے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے حجاز کا سفر کیا، اور یمن و نجد کی عربی تحریکوں کے مطالعہ کے سلسلے میں ان ممالک کی بھی سیاحت کی۔ ان کے نزدیک ترکوں سے اتصال کی بجائے عربی تحریک سے اتصال زیادہ محبوب تھا۔ الغرض مولٰینا محمد اسحاق کے حجاز جانے کے بعد مولٰینا ولایت علی نے پٹنہ میں اپنی مستقل پارٹی کا اعلان کر دیا۔ اس کے خلاف مولٰینا اسحاق نے حزب ولی اللہ کے کام کو چلانے کے لئے دہلی میں جو انتظام کیا تھا اُسے آپ کمپنی کے کارندوں سے مخفی رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ اسی غرض کے پیش نظر انہوں نے اپنا مرکز مولٰینا مملوک علی کے حوالہ کیا تھا۔ جو ایک سرکاری ملازم تھے۔ اور آپ نے اپنے خاص اصحاب کی جماعت کو ان کے تابع کر دیا تھا۔ یہ سبب تھا جس کی وجہ سے شاہ محمد اسحاق کی جماعت کے مقابلہ میں مولٰینا ولایت علی کی

---

[1] اصلاحی فکر، یعنی حنفی مذہب کی پابندی اور ترکوں سے اتصال۔ وہ حنفی مذہب کی پابندی کو حجۃ اللہ کے خلاف اور ترکوں سے اتصال کو یمنیوں اور نجدیوں کے خلاف جانتے تھے۔

پارٹی اس وقت زیادہ نمایاں[1] ہوگئی۔ وہ ہندوستانی عالم جو کہ مذہباً زیدی شیعہ تھا، اور امیر شہید نے اُسے اپنی جماعت سے نکلوادیا تھا، وہ بھی مولینا ولایت علی کے ساتھ شامل ہوگیا۔ نواب صدیق حسن خاں اسی استاد کے توسط سے امام شوکانی کے شاگرد ہیں۔ مولینا نذیر حسین دہلوی اور مولینا عبداللہ غزنوی بھی مولینا ولایت علی کی پارٹی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔

مولینا ولایت علی کی پارٹی کا مرکزی فکر یہ بتایا جاتا ہے کہ امیر شہید غیر معین عرصہ کے لئے غائب ہوگئے ہیں، ان کے انتظار میں جہاد کی تیاری کرتے رہنا چاہیئے، وہ ضرور آئیں گے اور انہی کی امامت میں کام کرنے سے ہمیں نجات مل سکتی ہے۔ بظاہر یہ فکر نہایت غیر معقول معلوم ہوتا ہے۔ مگر بڑے بڑے عالموں اور صوفیوں کا جو حزب ولی اللہ سے اختصاص رکھتے ہیں، اس تحریک کی شمولیت کے سلسلہ میں نام لیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تاویل یہی ہوسکتی ہے کہ عوام (نہ کہ خواص) کو اس تحریک کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لئے یہ ایک سیاسی چال تھی۔

مولینا ولایت علی نے ہندوستان کے مشرقی[2] حصہ پر اپنا اثر قائم

---

[1] بظاہر مولینا اسحاق ہندوستانی کام چھوڑ گئے تھے۔ اور ان کی بجائے مولینا ولایت علی نے کام سنبھال لیا تھا، مگر درحقیقت مولینا محمد اسحاق نے حجاز میں وہی کام کیا، جو وہ دہلی میں کیا کرتے تھے۔

[2] نواب صدیق حسن خاں "تاج الکرامۃ" میں لکھتے ہیں "عظیم آباد (پٹنہ) اور بنگالہ کی ایک بڑی جماعت

(بقایا صفحہ ۱۳۳ پر دیکھیے)

گیا، اور سرحد پار کے افغانی پہاڑوں میں اپنا مستقل مرکز بنایا، ان کی اولاد اب تک اس علاقہ میں اپنی امارت اور اپنا مرکز رکھتی ہے۔ اُن کے مخالفوں کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ وہ ایک چھوٹے پیمانے پر امیر شہید کی حکومت مؤقتہ کی یادگار ہے۔ مولینا ولایت علی کی تحریک کے متعلق ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ مولینا اسماعیل شہید کی اس خاص جماعت کو جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، زندہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اسی لئے مولینا نذیر حسین اور نواب صدیق حسن جیسے عالم بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں۔

مولینا نذیر حسین مولینا ولایت علی کے مدرسہ صادق پور پٹنہ کے ابتدائی طالب علم ہیں۔ بہار سے جب دہلی پہنچے تو مولینا محمد اسحاق اور ان کے اصحاب کی صحبت میں بیٹھے۔ اور علمی تکمیل کی۔ غزوہ دہلی (۱۸۵۷ء) تک مولینا اسحاق کے مسلک کے پابند رہے، اس کے بعد اگرچہ بہ ضرورت نجدی تحریک اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی طرف میلان ظاہر کرتے رہے

(بقایا نوٹ صفحہ ۱۳۲)

سید احمد مرحوم بریلوی کے بارے میں یہ بھی گمان رکھتی ہے کہ وہ مہدی تھے۔ چنانچہ مرحوم کے بعض مریدوں نے چالیس حدیثیں جمع کی ہیں جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ ہی مہدی تھے۔ یہ لوگ سید احمد مرحوم کے غائب ہونے کے قائل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ وہ سرحد پار کے پہاڑوں میں شہید نہیں ہوئے۔ اسی بنا پر یہ ان کے واپس آنے کے منتظر ہیں۔ یہ بڑی بھاری لغزش ہے۔ آخر سید مرحوم نے کب ایسا دعویٰ کیا تھا؟ اور دوبارہ آنے کا کب کہا تھا؟ بالفرض محال اگر وہ ایسا کرتے بھی تو کوئی انکی تصدیق نہ کرتا (مولینا کی کتاب التمہید کے مسودہ سے)

مگر فتاویٰ عالمگیری کا مشغلہ ہدایہ کی تدریس اور وحدۃ الوجود[1] کا فلسفہ اُن کی پُرانی ذہنیت کا عنوان آخر تک قائم رہا، اگر عوارض سے قطع نظر کر لی جائے تو وہ مولینا اسماعیل شہید کی اس مذکورہ جماعت کے احیا کے سوا اور کوئی مقصد نہیں رکھتے تھے۔ بہرحال اسے انگریزی حکومت کے اثرات کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے کہ مولینا احمد علی سہارنپوری کلکتہ میں اور مولینا نذیر حسین دہلی کے مرکز میں بیٹھتے ہیں تاکہ ہر ایک اپنے اپنے مرکز میں کام نہ کر سکے۔

مولینا ولایت علی کی جماعت کے دوسرے ممتاز عالم نواب صدیق حسن خاں ہیں۔ آپ کے والد ماجد[2] مولینا رفیع الدین کے خواص اصحاب میں سے تھے۔ نواب صاحب نے مولینا صدر الدین دہلوی سے تحصیلی کتابیں پڑھیں۔ اور مولینا محمد یعقوب دہلوی سے سندِ حدیث حاصل کی۔ اپنی کتاب "الحطۃ" کی تصنیف تک حزب ولی اللہ کے معارف کی ترجمانی کرتے رہے۔ لیکن اس کے بعد ان کی سیاسی مصلحت نے ان کو امام شوکانی کے اتباع پر مجبور کر دیا۔

آخر میں ہم صادق پوری پارٹی کے مرکزی فکر کے متعلق مولینا

---

[1] تفصیل ملاحظہ ضمیمہ نمبر ۳۹

[2] نواب صاحب کے والد ماجد حسن بن علی بن لطف اللہ حسینی ہیں۔ آپ ۱۲۳۳ھ میں دہلی آئے اور شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین سے پڑھا، موصوف عارف کبیر سید احمد بریلوی کے ساتھ رہے اور ان کی بیعت میں جہاد کیا۔ سال وفات ۱۲۵۳ھ ہے۔

شمس الحق عظیم آبادی (تلمیذِ خاص سید نذیر حسین) کی کتاب "عون المعبود" سے چند جملے نقل کرکے اس بحث کو ختم[1] کرتے ہیں۔

اکثر عوام اور چند ایک خواص[2] کا غازی شہید امام امجد سید احمد بریلوی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ مہدی تھے اور نیز انہوں نے میدان غزا میں شہادت نہیں پائی۔ بلکہ وہ لوگوں کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ اور وہ اب تک زندہ ہیں۔ اور اس عالم میں موجود ہیں۔ بعض تو اس معاملہ میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے انھیں مکہ معظمہ میں طواف کرتے دیکھا۔ لیکن پھر وہ یکبارگی غائب ہو گئے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ سید صاحب ضرور واپس آئیں گے۔ در اصل یہ بات غلط اور باطل ہے صحیح حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب معرکۂ غزا میں شہید ہو گئے، اور وہ لوگوں کی نظروں سے غائب نہیں ہوئے، اور اس سلسلہ میں جو روائتیں ہیں اُن میں سے اکثر جھوٹی اور گھڑی ہوئی ہیں۔ اور ان میں سے جو صحیح ہیں ان کو اچھے محمل پر محمول کرنا چاہیئے۔ بد قسمتی سے امیر شہید کی

---

[1] اصل عبارت عربی میں تھی، یہاں اس کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

[2] چند ایک خواص سے مراد مولینا ولایت علی ہیں۔ موصوف نے بڑی مستعدی سے اس دعوت کو پھیلایا تھا۔ اور اس میں ایک بڑی جماعت ان کے پیچھے لگ گئی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ جماعت روبہ اضمحلال ہو گئی۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل اور شاہ اسحاق کے حنفی طریقے کو چھوڑنے کی ضرورت محسوس کی۔ اور ۱۸۵۷ء کے معرکۂ دہلی میں بے تعلق رہے، ہم انھیں حزب صادقپوری کا نام دیتے ہیں۔ (کتاب التمہید مولینا عبید اللہ صاحب سندھی۔ نسخہ غیر مطبوعہ عربی سے ترجمہ کیا گیا۔

زندگی اور ان کا نظروں سے غائب ہونے کے مسئلے نے ایک نزاعی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اُسے اپنے عقیدہ کا جزو بنالیا ہے۔ چنانچہ جو اس کو نہ ملنے، یہ لوگ اس سے بحث کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی بے راہ روی کی اللہ کی ہی بارگاہ میں شکایت ہوسکتی ہے، اور ہم خود اس غیر معقول اور بے بنیاد عقیدہ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں"

یہ اجمالی خاکہ ہے حزب ولی اللہ کے اس گروہ کا، جو شاہ محمد اسحاق کے مسلک سے الگ رہا۔ اور جسے ہم حزب صادق پوری کا نام دیتے ہیں۔ اب شاہ محمد اسحاق کی دہلوی جماعت کا حال سنئے۔

مولٰنا محمد اسحاق کی امامتِ تحریکِ ولی اللہی پر ابھی پورے تیس برس نہ گزرے تھے کہ دہلی کے آخری بادشاہ کی انگریزی کمپنی سے لڑائی ہوگئی۔ گو سلطان دہلی کی حیثیت بظاہر ایک وظیفہ خوار رئیس کی تھی لیکن عام لوگوں کی نظروں میں وہ اب تک سارے ہندوستان کا موروثی سلطان تھا۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی اسی کے نام سے عوام پر حکومت کرتی تھی۔ چنانچہ ڈھنڈورے میں منادی کرنے والا کہا کرتا تھا۔" خلق خدا کی۔ ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا" اس لئے عوام الناس کی رائے اُسے ملک کا حقیقی مالک ماننے میں تامل نہیں کرتی تھی۔

سقوط دہلی کا واقعہ جو ۱۸۵۷ء، ۱۸۵۸ء میں پیش آیا۔ اسلامی دنیا کی

تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، ہماری رائے میں ہندوستانی وہی ہے جو اس ہندوستانی سلطنت کے زوال کو اپنی قومی مصیبت سمجھتا ہو۔ اس حادثۂ کبریٰ میں مولٰینا محمد اسحاق کی نئی جماعت پھر دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ مولٰینا موصوف نے جس گروہ کو اپنی نئی تنظیم میں مرکزی اختیارات دیئے تھے، اس گروہ نے ۱۸۵۷ء میں سلطان دہلی کی طرفداری کی، اور شکست کے بعد مولٰینا محمد اسحاق کی طرح حجاز پہنچ گیا۔ چنانچہ امیر امداد اللہ اور مولٰینا عبد الغنی، مولٰینا محمد یعقوب دہلوی کے ساتھ حجاز میں بیٹھ کر ولی اللہی تحریک کی ہندوستانی تنظیمات کی رہنمائی کرتے رہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولٰینا محمد اسحاق کے متبعین کی پہلی صف میں سے علماء اور صوفیہ کا کثیر حصہ سلطان دہلی کی لڑائی میں غیر جانبدار بن گیا۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ اگر ایک طرف مولٰینا محمد اسحاق کی تنظیم کے مقابلہ میں پٹنہ کی صادق پوری پارٹی قائم ہو چکی تھی تو دوسری طرف خود شاہ اسحاق کے اپنے گروہ میں سے ایک مخالف جماعت دہلی میں پیدا ہوگئی۔ مولٰینا نذیر حسین دہلوی اور مولٰینا شیخ محمد تھانوی اس دوسری جماعت کے مشہور بزرگوں[۱] میں سے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ امام عبد العزیز کی حزب میں انشقاق کا جو بیج بالاکوٹ کی ہزیمت کے بعد بویا گیا تھا۔ اس کے تلخ ثمرات کا تسلسل کسی طبقہ میں نہیں ٹوٹتا۔ جس طرح مولٰینا محمد اسحاق کی جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔

---

[۱] شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں، جن کے مسلک پر مولٰینا اشرف علی صاحب کاربند ہیں، اور شیخ الہند کی جماعت کی سیاست کو غلط مانتے ہیں۔

اسی طرح امیر امداد اللہ کی جماعت میں، اور پھر ان کے بعد میں مولانا شیخ الہند کی جماعت میں مخالف پارٹی[1] کے افراد اور گروہ مخلوط چلے آتے ہیں۔ امام عبدالعزیز کی حزب سے اس قسم کے مخالف عناصر کو قطعی طور پر پاک کرنے کے لئے جب تک دانش مند نوجوان کمر ہمت نہیں باندھیں گے۔ یہ تحریک کبھی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔

قصہ کوتاہ ولی اللہی تحریک کے دوسرے دور کی ابتدا میں مولانا محمد اسحاق کی مرکزی جمعیت حجاز میں بیٹھ کر ہندوستان میں اس تحریک کے کاموں کی رہنمائی کرتی رہی۔ مولانا محمد اسحاق اور ان کے بعد امیر امداد اللہ کو مکہ معظمہ کے قیام کے دوران میں اپنی تحریک کو جاری رکھنے میں جس قدر مشکلات پیش آئیں، اُن پر غالب آنا ان کے حزم اور حلم کی روشن دلیل ہے۔ اور ہم اسے امام عبدالعزیز کی تربیت سلسلہ کی برکات میں شمار کرتے ہیں۔ اگر یہ حضرات امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ نہ ہوتے تو کبھی اپنا کام جاری نہ رکھ سکتے۔ نیز ہم اگر خود مکہ معظمہ[2] میں اس قسم کی زندگی کا تجربہ نہ کر چکے

---

[1] ہم یہ حکم اس لئے لگاتے ہیں کہ ہم نے یورپ کی سیاسیات کا مطالعہ کیا ہے۔ اِن کے ہاں پارٹی کے نظام کو مخالف عنصر سے پاک رکھنا سب سے اول درجہ کا فرض ہے۔ اور وہ اس بارے میں کشت و خون سے ذرہ برابر نہیں گھبراتے، اسی میں انکی فلاح اور کامیابی کا راز مضمر ہے۔

[2] مکہ معظمہ میں کوئی خفیہ تحریک نہیں چلائی جا سکتی تھی، اور نہ اب چلائی جا سکتی ہے۔ ہر کام کرنے والے کے سر پر اس قدر غیر منظم عوام کا ہجوم مسلط رہتا ہے کہ اسے سر کھجلانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ مگر پھر بھی جو کام کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ میں حیران رہ گیا جب مجھے معلوم

(بقیہ صفحہ ۱۳۹)

ہوتے۔ اور پھر حضرت مولینا شیخ الہند کے قیام مکہ معظمہ کے واقعات ہمارے سامنے نہ ہوتے تو ہم ان اکابر کی محنت کی قدر نہ کر سکتے۔

دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

۱۸۵۷ء میں جب دہلی کی سلطنت کی آخری نشانی بھی مٹ گئی تو اس کے دو سال بعد شاہ محمد اسحاق کی مرکزی جمعیت نے جواب حجاز میں مقیم تھی اور امیر امداد اللہ کی رہنمائی میں ہندوستانی کام کرتی تھی فیصلہ کیا کہ اطرافِ دہلی میں امام عبدالعزیز کے مدرسہ کے نمونہ پر ایک مدرسہ بنایا جائے۔ چنانچہ مولینا محمد قاسم اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سات سال تک مسلسل کوشش کرتے رہے، تب کہیں جا کر ۱۲۸۳ھ یعنی ۱۸۶۶ء میں سقوط دہلی کے نو سال بعد مدرسہ دیوبند کی

بقایا نوٹ صفحہ ۱۳۸:-

ہوا کہ مولینا اشرف علی صاحب جو مولینا شیخ محمد تھانوی کے مسلک کے متبع ہیں، وہ امیر امداد اللہ کے مخصوص اصحاب میں رہ چکے ہیں۔ اسکے بعد اسی طرح مولینا شیخ الہند کے قریبی دوست حجاز کے سفر میں ہر وقت اُن کے ساتھ رہتے تھے تاکہ وہ کوئی خفیہ کام نہ کر سکیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اس قسم کے کام کرتے رہے۔ اور انہوں نے اس کے لئے اوقات فرصت بھی نکال لئے۔ اس سے مجھے یہ قیاس کرنے میں آسانی ہوئی کہ اسی طرح امیر امداد اللہ بھی اپنے لئے وقت نکال لیتے ہوں گے۔ میں خود بھی اسی طرح کی مصیبت میں مبتلا رہا ہوں، اگرچہ میرا ہندوستان سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا، مگر یورپ میں میرے کافی دوست موجود تھے۔ اور کابل کے لوگ بھی مجھ سے ملتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس بناء پر مجھے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا، لہذا اپنی اِن تکالیف اور مولینا شیخ الہند کی مجبوریوں کو سامنے رکھ کر حاجی امداد اللہ صاحب کے کام کی جس قدر اہمیت میں سمجھتا ہوں، دوسرا شخص اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

تاسیس ہو سکی۔ اس کے بعد ان کی دوڑ دھوپ سے اسی طرز پر ایک مدرسہ سہارنپور میں اور ایک مراد آباد میں بنا۔ جو مدرسہ دیوبند ہی کی شاخیں تھیں۔ اب تک شاہ محمد اسحاق کی مرکزی جمعیت کی رہنمائی امیر امداد اللہ کے سپرد تھی، اور موصوف مکہ معظمہ میں بیٹھ کر اس تحریک کو چلاتے تھے۔ جب مدرسہ دیوبند کی تاسیس عمل میں آ گئی تو اس جماعت نے مدرسہ مذکور کو اپنا مرکز بنا لیا۔ اس مدرسہ کے تمام کام امیر امداد اللہ کی مصلحت پر چلتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دیوبند کی روح دراصل امیر امداد اللہ کی مصلحت پر چلنا ہے۔

مدرسہ دیوبند کے لئے ہفت سالہ نصاب تعلیم اور مستقل نظام عمل اور اساسی قواعد مولینا محمد قاسم نے بنائے۔ اس طرح انہوں نے اپنی سکیم میں امام عبدالعزیز کے مدرسہ اور حزب ولی اللہ کے مقاصد کو محفوظ کر دیا۔

لہ سنہ ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی بنا پڑی، اس کے فوراً بعد ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کی شاخیں قائم کی جانے لگیں۔ چنانچہ مدرسہ دیوبند کے چھ ماہ بعد سہارنپور میں ایک شاخ کھلی۔ آخر میں تو ان شاخوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے چالیس تک پہنچ گئی تھی۔ مدرسہ دیوبند کی ان شاخوں کا نظام "لامرکزی" تھا، یعنی یہ سب کی سب دارالعلوم کے تابع اور اس کے قوانین کی مقید نہ تھیں۔ شروع شروع میں جب میں "جمعیت الانصار" کی تنظیم کا کام کرتا تھا تو میری خواہش یہ تھی کہ یہ نظام لامرکزی کی بجائے مرکزی ہو جائے، لیکن میرے استاد شیخ الہند اس خیال کی طرف کم التفات فرماتے۔ اس واقعہ کے تین سال بعد مجھے تجربہ سے معلوم ہوا کہ لامرکزی نظام کس قدر مفید تھا۔ لامرکزیت کی وجہ سے حکومت ان شاخوں کے سارے نظام کو اپنے قابو میں نہیں کر سکتی۔ بیشک مرکزیت کی وجہ سے ظاہری صورت اچھی ہو جاتی، لیکن آزادی بہر حال ظاہری صورت سے مقدم ہوتی ہے (کتاب التمہید صفحہ ۱۵۶ عربی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

اس کے بعد دو بار مدرسہ دیوبند کے نصاب پر نظر ثانی ہوئی، پہلی دفعہ مولینا محمد یعقوب صاحب دیوبندی کے زمانہ میں سات سال کے بجائے یہ نصاب ہشت سالہ کر دیا گیا۔ دوسری بار مولینا شیخ الہند نے تحریک جمعیت الانصار کی بنا ڈالی۔ الحمد للہ کہ دونوں دفعہ حزب ولی اللہ کی تعلیمات کی روح محفوظ رہی۔ اب جب کبھی مدرسہ کے نصاب میں ترمیم کا سوال پیدا ہوتا ہے، میری خواہش یہ ہوتی ہے کہ پہلے کا ہفت سالہ نصاب تعلیم محفوظ رہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ مصر و شام کی تقلید میں کہیں اس نصاب میں قطع و برید نہ کر دی جائے، جس کی وجہ سے اس کی وہ استعداد ختم نہ ہو جائے، جس کے سبب سے اب تک یہ نصاب امام ولی اللہ کی حکمت کے مطالعہ کے لئے مقدمہ بنتا رہا ہے۔

مدرسہ دیوبند کا مرکزی فکر اور اس کی سیاسی مصلحت کے اصول امیر امداد اللہ اور ان کے رفقاء مولینا محمد قاسم، مولینا رشید احمد، اور مولینا محمد یعقوب دیوبندی کی جماعت نے معین کئے تھے اسلئے دیوبندی پارٹی کی مرکزی جماعت میں وہ شخص شامل نہیں ہو سکتا، جو یہ اصول کاملاً تسلیم[1] نہ کرتا ہو۔ مدرسہ دیوبند کا اساسی اصول یہ ہے کہ حزب ولی اللہ نے اپنے پہلے دور میں جس قدر علوم و معارف کی اشاعت ضروری سمجھی، حنفی فقہ کی پابندی سے ان علوم و معارف کو تدریس و تصنیف کے ذریعہ زندہ رکھا جائے۔ نیز اس مدرسہ کی باقاعدہ تعلیم سے جس قدر علماء تیار ہوں، وہ

---

[1] مولینا اشرف علی صاحب کے اتباع کا مرکز زیر قبضہ کرنا طے شدہ اصول کے خلاف ہے۔

مساجد اور مدارس میں کام کرنے کے لئے پوری استعداد رکھتے ہوں۔ اس تعلیم کے بعد جس قدر علمار امام ولی اللہ کے جادۂ قومیہ اور حکمت کی حفاظت کرنا چاہئیں یا اپنے اندر حکومت کے مناصب عالیہ کی اہلیت پیدا کریں، تو ان کے لئے کوئی خاص نصاب معین نہیں ہے، وہ درسی کتابوں سے فارغ ہو کر اساتذہ کی صحبت میں رہیں۔ مثلاً یہ علمار مولٰینا محمد قاسم کی صحبت میں امام ولی اللہ کی حکمت سے آشنا ہو سکتے تھے۔ مولٰینا محمد یعقوب دیوبندی کی رفاقت میں سیاسی اصول سمجھ سکتے تھے۔ اور امیر امداد اللہ کی بیعت سے پارٹی میں منسلک ہو سکتے تھے۔

مدرسہ دیوبند کے لئے ضروری ہے کہ حکومت کابل میں اپنا وقار پیدا کرے، اس لئے ماورائے دریائے سندھ سے جس قدر طلبہ دیوبندی نظام کے ماتحت تعلیم پائیں، انھیں ہدایت کر دی جائے کہ وہ اپنی قوم کے نظام اور اپنی حکومت کے آئین کو برہم نہ کریں۔ جس طرح ہندوستان میں دیوبندی جماعت مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کے ساتھ بالاضطرار منازعت میں مبتلا ہو گئی ہے۔ کوشش کی جائے کہ یہ جھگڑے دریائے سندھ سے اُدھر نہ پھیلنے پائیں۔ [1]

مدرسہ دیوبند کے لئے ضروری ہے کہ مکہ معظمہ کے مرکز کے توسط سے سلطنت عثمانیہ کے ساتھ اپنا ربط زیادہ مستحکم کرتا رہے۔ نیز اضطراری حالات کو چھوڑ کر مدرسہ دیوبند کو چاہئے کہ حکومت انگریزی کے مصالح

---

[1] یعنی وہاں جا کر اہل بدعت اور اہل حدیث کے ردّ کے جھگڑے پیدا نہ کریں۔

سے غیر جانب داری اختیار کرے۔

مدرسہ دیوبند کی تاریخ کا پہلا دور مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات پر ۱۳۲۳ھ میں ختم ہوتا ہے۔ اس چہل سالہ دور کا سب سے بڑا کارنامہ علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کی حفاظت ہے۔ اس عہد میں مدرسہ دیوبند کی علمی تحریک اطرافِ ہند سے نکل کر افغانستان و ترکستان اور حجاز اور قازان تک پہنچ گئی۔ اس اثنا میں دیوبند کے مرکزی فکر پر جس قدر بھی حملے ہوئے خواہ وہ نصاریٰ اور ہنود کی طرف سے ہوں یا شیعہ و مبتدعین طرف سے۔ یا نجدی و یمنی ذوق رکھنے والے ہندوستانیوں کی طرف سے، یا یورپین ذہنیت رکھنے والے نوجوانوں کی طرف سے، ان میں سے اکثر اعتراضات کے جوابات محققانہ اور مجادلانہ تیار ہو گئے۔

یہ مدرسہ دیوبند کے پہلے دور کا کارنامہ ہے۔ مدرسہ دیوبند کا دوسرا دور ۱۳۲۳ھ میں حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی شیخ الہند کی صدارت سے شروع ہوا۔ اور ۱۳۳۹ھ میں ان کی وفات پر ختم ہوا۔ اگر امام عبدالعزیز کی وفات پر ۱۲۳۹ھ میں حزب ولی اللہ کا پہلا دور ختم کر دیا جائے۔ اور امام ولی اللہ کے کام کی ابتدا ۱۱۴۴ھ سے پانچ سال پہلے جب کہ انہوں نے ترجمۂ قرآن لکھنا شروع کیا تھا مان لیا جائے تو حزب ولی اللہ کا پہلا دور بھی سو سال کا بن جاتا ہے۔ اور دوسرا دور بھی پورے سو سال کا قرار پاتا ہے۔

مدرسۂ دیوبند کے دوسرے دور میں سب سے پہلے مولانا شیخ الہند نے مدرسہ کے پرانے فارغ شدہ عالموں کو جمعیت الانصار میں جمع کرنا شروع

کیا۔ اس طرح دیوبندی نظام کی تعلیم یافتہ جماعتوں کی ساری اجتماعی طاقت منظم ہو گئی۔ اور اس نظام میں جس طرح ہندوستان کے علماء داخل ہوئے اسی طرح افغانی اور ترکستانی علماء بھی شامل ہو گئے۔ نیز درجہ تکمیل جواب تک غیر منظم صورت میں تھوڑے سے افراد پر مشتمل تھا، اس کے قواعد وضوابط منضبط ہو گئے، اور مولانا شیخ الہند نے امام ولی اللہ اور مولانا محمد قاسم کی کتابوں کو اس درجہ کی تعلیم کا لازمی عنصر قرار دیا۔ علاوہ ازیں مدرسہ دیوبند کو دار العلوم کے درجہ تک پہنچایا گیا۔ اور دار الحدیث کو اس کی مرکزی درسگاہ (کالج) قرار دیا گیا۔

مولانا شیخ الہند نے ۱۹۱۴ء کی جنگ عمومی میں ٹرکی کے شامل ہو چکنے کے بعد جمعیت الانصار کے توسط سے اپنی پارٹی کی پوری طاقت کو دولت عثمانیہ کی تائید میں جو اس وقت خلافت اسلامیہ کی حامل تھی استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ مولانا شیخ الہند کی تحریک باوجودیکہ ایک مذہبی اساس پر مبنی تھی، دُنیا کی انقلابی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ انقلاب فرانس بھی ایک مذہبی عالم کی تحریک سے شروع ہوا تھا۔ اور اس کی وجہ سے فرانس کی انقلابی طاقت کی توہین نہیں ہو سکتی۔ ہم اس وقت مولانا شیخ الہند کی اس تحریک کی تفاصیل ان صفحات میں بیان کرنا نہیں چاہتے۔ ہمیں یقین ہے کہ آنے والے دور کے مؤرخ اسے نہایت صفائی سے لکھ سکیں گے۔

---

[1] مولانا شیخ الہند نے ہمیں کابل بھیجا۔ وہاں جا کر ہم نے شیخ الہند کی پچاس سالہ محنت کا نتیجہ دیکھا۔ امیر امان اللہ کا بروئے کار آنا۔ مولانا شیخ الہند کی جماعت کے کام کی ایک برکت ہے۔ امیر امان اللہ شکست کھا جاتے ہیں۔ مگر ہم اس سے نہیں گھبراتے۔ ان کی شکست کا نتیجہ ہمارا وہ مستقل پروگرام ہے جسے ہم انڈین نیشنل کانگریس کے رہتے ہوئے جاری کرنا چاہتے ہیں (اس پروگرام کی تفصیل آگے آتی ہے)

ہندوستان، انگلستان، افغانستان اور ترکستان کی تاریخ تو اس واقعہ کے بغیر مکمل ہوئی نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ یورپ کی انقلابی طاقتیں بھی اس کا احترام کرنے پر مجبور ہیں۔

مولانا محمد اسحاق نے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ۱۲۳۹ھ کے بعد حزب ولی اللہ کے دوسرے دور کو دولت عثمانیہ کے اتصال سے شروع کیا تھا۔ بعد میں مولانا شیخ الہند کے مشائخ نے اسے تکمیل کو پہنچایا۔ مگر ۱۹۱۸ء

ا؎ پہلے ہمارا خیال تھا کہ مولانا شیخ الہند کے ان واقعات کے متعلق اجمالی اشارے حاشیے میں لکھوا دیں گے جس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ لیکن بعد میں ہماری رائے بدل گئی کیونکہ اس اہم معاملہ میں اشاروں سے کام نہیں نکلنے کا۔ اب ہمارا فیصلہ ہے کہ اس موضوع پر انگریزی میں مستقل رسالہ لکھوائیں گے۔ جس میں پہلے تو مولانا شیخ الہند کا اس تحریک میں اصلی مقام کیا تھا، اسے بیان کریں گے۔ ہمارے نزدیک مولانا محمد قاسم حکیم الہند امام ولی اللہ کی حکمت اور انقلاب کے مجدد تھے۔ اور مولانا شیخ الہند اپنے استاد مولانا محمد قاسم کے علم و عمل کے آرگنائزر۔ اس کے بعد سر پرسی کاکس اور مسٹر مانٹیگو وغیرہ برطانوی مدبرین کے بیانات کی روشنی میں اس تحریک کی سرگرمیوں پر بحث ہوگی۔

مولانا شیخ الہند جب مالٹا میں اسیر ہوئے تو وہاں دول یورپ کے مختلف نمائندوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ حیران تھے کہ ایک ہندوستانی جو برطانوی "سبجکٹ" ہے گورنمنٹ سے لڑائی کا اعلان کرتا ہے اور وہ کس طرح سزائے موت سے بچ گیا۔ اور پھر اسے جنگی قیدی کا اعزاز کیوں دیا گیا۔ مولانا شیخ الہند کے خدام جو یورپ میں کام کر رہے تھے، ان حکومتوں کے لوگ جب ان سے ملے تو انھیں اس تحریک کی تحقیق کا موقعہ ملا۔ ہم سے بھی جب کبھی یہ لوگ کابل یا یورپ میں ملے تو انھیں مسائل کے متعلق بحث کرتے رہے اس رسالہ میں ان مباحث کا خلاصہ بھی دیا جائیگا۔ مضمون کی نوعیت کا تقاضا ہے کہ یہ کتاب انگریزی میں شائع ہو۔

میں گذشتہ جنگ عظیم کے موقعہ پر جب دولت عثمانیہ ساقط ہوگئی، تو حزب ولی اللہ کا دوسرا دور بھی ختم ہوگیا۔ مولانا شیخ الہند نے دولت عثمانیہ کی تائید کے لئے جو تحریک شروع کی تھی، اس کا مرکز دہلی تھا۔ اس سے ضمنی طور پر ہندوستانی انقلاب کی تائید میں ایک غیر متوقع صورت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ مولانا شیخ الہند نے اب ہندوستانی انقلاب ہی کی اس تحریک کو اپنا مستقل موضوع بنالیا۔ اس کو ہم حزب ولی اللہ کا تیسرا دور شروع کرتے ہیں۔

مختصراً حزب ولی اللہ کا دوسرا دور مولانا محمد اسحاق دہلوی نے ۱۲۴۶ھ میں شروع کیا تھا۔ اور ۱۳۳۹ھ یعنی ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی قدس سرہ کی وفات پر یہ دور ختم ہوگیا۔ یہاں سے ہم تیسرے دور کی ابتدا رمانتے ہیں۔ چنانچہ حزب ولی اللہ کے تیسرے دور کے اساسی اصول ہمارے نزدیک حسب ذیل ہیں۔

(۱) مولانا شیخ الہند نے امام ولی اللہ کی حکمت پڑھانا ضروری قرار دیا۔ اس سے ہم ایک خاص نتیجہ نکالتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ ہم امام ولی اللہ کی فلاسفی کو اپنی مستقل پارٹی کا اساسی اصول بناتے ہیں، امام ولی اللہ کی فلاسفی غیر مسلم ہندوستانی کو بھی اپنے ساتھ لے سکتی ہے۔ نیز یہ یورپین ازم کی لادینیت کو فنا کر سکتی ہے۔ اور اس فلاسفی نے اقتصادیات کے متعلق جو اصول سلجھائے ہیں، اس کی بنا پر یہ تمام دنیا پر تفوق حاصل کر سکتی ہے۔

(۲) مولانا شیخ الہند نے علی گڈھ کالج کے انقلابی عنصر کو اپنی تحریک میں شامل کر لیا تھا۔ چنانچہ ان کے پارٹی پروگرام کو چلانے والے ایک

لہ اس دور کی ابتدا ترکی اتصال سے شروع ہوئی۔ جب ترکی خلافت ختم ہوگئی تو وہ پرانا پروگرام بھی بیکار ہوگیا

طرف مولانا کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد تھے، تو ان کے ساتھ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی مساوی درجہ پر شریک تھے۔ مولانا شیخ الہند کے اس اقدام سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہم "یورپین ازم" کو اپنی مستقل پارٹی کے پروگرام میں داخل کرتے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا انگریزی پڑھا طبقہ جسے ہم کالج پارٹی کا نام دیتے ہیں آگے چل کر لامحالہ طور پر ترکوں کے کمالی پروگرام کو قبول کرے گا۔ چونکہ ترکی میں کمالی پروگرام کے ساتھ لادینیت بھی آگئی ہے۔ اور لادینیت کے معاملہ میں ہم سکوت نہیں کر سکتے۔ اس لئے اس کو روکنے کے لئے ہم امام ولی اللہ کی فلاسفی کو اپنے پروگرام کا ضروری اساس بناتے ہیں۔

(۳) مولانا شیخ الہند انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہوگئے تھے۔ اس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ عدم تشدد کی پالیسی سے ڈومینین اسٹیٹس حاصل کیا جائے۔ ہماری مستقل پارٹی کے پروگرام کا یہ تیسرا اصول ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عدم تشدد کی پابندی کا لازمی نتیجہ صرف ڈومینین اسٹیٹس ہی ہوسکتا ہے۔

حزبِ ولی اللہ کے تیسرے دور کے لئے ہم جو پروگرام تجویز کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کے یہی تین اصول ہیں۔ جس طرح پہلے دور کے خاتمہ پر اللہ تعالےٰ نے مولانا محمد اسماعیل شہید اور ان کے رفقاء کے کارناموں سے ولی اللہی تحریک کو زندگی بخشی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ دوسرے دور میں مولانا شیخ الہند اور ان کے مشائخ نے جو خدمات سر انجام دی ہیں،

اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے اُن کو قبول فرمائے گا۔ اور اُن کے عزائم میں اس قدر برکت نازل کرے گا کہ امام ولی اللہ کی تحریک اپنے اس تیسرے دور میں ہندوستان کی اصلاح کر کے اُسے اس منزل پر پہنچا دی گی کہ وہ دنیا کی رہنمائی کا ذریعہ بن سکے! اللہ ہی ہے جو اس میں کارسازی فرمائے۔

حزب ولی اللہ کے تیسرے دور کے اس پروگرام کی مزید وضاحت کے سلسلہ میں چند باتیں اور لکھنا ضروری ہیں۔ ۲۱ ذی قعدہ ۱۱۴۴ھ جمعہ کی شب (۱۷۳۱ء) کو امام ولی اللہ نے ایک الہامی خواب[1] دیکھا تھا۔ جس میں آپ کو یقین دلایا گیا تھا کہ گردوپیش کے مفاسد کی اصلاح کے لئے اُن کو ایک مستقل ذمہ دار حیثیت دی جائے گی۔ اور نیز نظام سلطنت اتنا بوسیدہ اور بے کار ہو چکا ہے کہ اسے توڑ دیا جائے گا۔ اور اس کی جگہ نیا نظام قائم کرنے کے وہ ذریعہ بنیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے تمام دینی علوم، اور سیاسی و اجتماعی تحریکات میں امام ولی اللہ مستقل امام ہوں گے۔ تفہیمات ص ۱۲۰ و ۱۲۱ میں ایک اشارہ ہے کہ آپ کو اس الہام کی تکمیل کے لئے انبیاء کی طرح صبر کرنا چاہیئے۔ چنانچہ امام ولی اللہ نے اپنے فکر سے سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ کو متعارف کیا اور تعلیم و ارشاد کے لئے ایک جماعت تیار کر دی، ان کے بعد شاہ عبدالعزیز نے نظام حکومت چلانے کے لئے آدمی تیار کر دیئے۔ جنہوں نے ۱۸۲۶ء میں اپنی موقتہ حکومت بھی بنالی، لیکن بالاکوٹ کے حادثہ میں اس حکومت کو شکست ہوئی۔ اور

۱؎ ضمیمہ جات میں تفصیل ملاحظہ ہو۔

اور امیر شہید اور ان کے ساتھی شہادت پا گئے۔

یہاں ایک خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ شکست کیوں کھا گئے؟ ہم اپنی پرانی ذہنیت میں اس شبہے سے بہت متاثر رہے۔ اور ہر دو کسی کو دو چار جلی کٹی سنا کر اپنا جی ٹھنڈا کر لیتے تھے۔ مگر اثنائے سیاحت میں جب ہمیں یورپ کی انقلابی تحریکوں کے مطالعہ کا موقعہ ملا۔ تو یہ اصول سمجھ میں آیا کہ ایک اعلیٰ انقلاب کے لئے متعدد بار شکست کھانا چنداں بعید نہیں ہے۔ خود اسلام کی ابتدائی تاریخ میں باہمی خانہ جنگیاں پیدا ہوتی رہیں۔ یہ چیز اصل میں انقلابی تحریک کے لوازم میں سے ہے۔ اس کے بعد ہم مطمئن ہو گئے کہ اگر شاہ صاحب کی تحریک ایک بار شکست کھا گئی۔ تو یہ حقیقت میں تحریک کی شکست نہیں ہے، اس کے بعد ہم نے اپنے دیوبندی اساتذہ کے کام کو شاہ صاحب کی تحریک کا دوسرا دور قرار دیا۔ اس دوسرے دور کو ہم مولینا شیخ الہند کی وفات پر ختم کرتے ہیں۔ اس دور میں بھی وہ تحریک شکست کھا چکی ہے، مگر وہ اپنے نتیجہ میں تیسرے دور کے لئے مبادی تیار کر گئی ہے اور میں اسی امید پر زندہ ہوں۔ مجھے اس تحریک کی آخری کامیابی میں کسی قسم کا شبہ و تردد دامنگیر نہیں ہے۔

مثلاً سوشلسٹ انقلابی تحریک سب سے پہلے فرانسیسی انقلاب کے موقع پر شروع ہوئی، اور ٹوٹ گئی، پھر دوسری بار منظم ہوئی، اور شکست کھا گئی۔ بعد ازاں روس میں لینن نے اس کو تیسری بار منظم کیا اور اس کا نام اسی مناسبت سے تھرڈ انٹرنیشنل تجویز ہوا۔ اصل کارل مارکس

کے نظام میں اور لینن کے موجودہ نظام نامہ میں بہت کچھ تبدیلی آچکی ہو۔ مگر وہی تحریک اپنے تیسرے دور میں کامیاب ہو کر رہی، اور زمین کے ایک بڑے قطعے پر اپنی حکومت قائم کر سکی۔

ہماری تحریک کے اس تیسرے دور میں میرے نزدیک حزب ولی اللہ کی سیاست میں مصطفےٰ کمال کا قومی انقلاب ایک جزو ہو گا۔ اور شاہ ولی اللہ کا عقلی اور اقتصادی فلسفہ اس پر حکومت کرے گا۔ نیز عدم تشدد کی پابندی سے انڈین نیشنل کانگرس کے اندر رہ کر حکومت بنانے کے لئے لائق آدمی تیار کرنا ضروری ہوں گے۔ میں ان اصولوں پر ایک نئی پارٹی مولٰینا شیخ الہند کی یادگار میں قائم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ہر سہ اصول حضرت شیخ الہند کے تلقین کردہ ہیں۔ مثلاً

۱۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفے کو وہ درجۂ تکمیل میں داخل کر چکے ہیں۔

۲۔ ان کے زمانے میں ترکی کی نقل علی گڑھ کالج میں موجود تھی۔ مولٰینا شیخ الہند کالج کی تحریک کو اپنے اندر ہضم کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ ان کے آگے کام کرنے والوں میں اگر ایک طرف مولٰینا کفایت اللہ اور مولٰینا حسین احمد تھے، تو دوسری طرف ڈاکٹر انصاری اور مولٰینا محمد علی بھی تھے۔ علی گڑھ کالج اگر ایک قدم آگے بڑھائے گا تو مصطفےٰ کمال کی نقل کرے گا۔ ہم اس ترقی یافتہ علی گڑھ کو اپنے اندر لینا چاہتے ہیں۔ دیوبندی جماعت کا جو آدمی یہ حوصلہ نہیں رکھتا، اس کو سیاسیات سے کنارہ کش ہو جانا چاہیئے، اس کو کوئی حق نہیں کہ اپنے کسی کام کو وہ شیخ الہند کی طرف

منسوب کرے۔

وَتِلْكَ شَرَائِعُ لِلشِّعْرِ قِيْدُ مَا   وَقَدْ نُسِخَتْ بِشَيْخِ الْهِنْدِ حَالًا

۳- رسول اللہ کی ملکی زندگی کیلئے شاہ صاحب نے جو سیاسی اصول مقرر کئے ہیں، ان کی اتباع اور انکی نہج پر تیاری کے لئے انڈین نیشنل کانگرس میں وسیع میدان ملتا ہے۔ اس اصول کو مد نظر کو رکھ کر ہم کانگرس میں نئی پارٹی بنانا چاہتے ہیں۔

ہماری قوم بڑا نے اصول حکمت بھول چکی ہے۔ اب وہ یورپین طریقے کے نظام حکومت پر ہی کامیاب ہو سکے گی، افغانستان، ترکی، عربی ممالک سب کے سب یورپین طریقے پر اپنی حکومتوں کی تجدید کر رہے ہیں۔ اب ہم یہاں شاہجہاں کی حکومت کا اعادہ نہیں کر سکتے۔ گو روح وہی رہے گی مگر حکومت کی صورت یورپین ہوگی۔ ہمیں ڈومنین اسٹیٹس قبول کرنا ہے۔ اس تیاری کے لئے ہمیں یورپ کی ایک بڑی حکومت کا تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ ہم بہت سی مصلحتوں کو ملحوظ رکھ کر برٹش کامن ویلتھ میں رہنا منظور کرتے ہیں۔ مگر کانگرس کے عام طرفدار ان چیزوں کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ یورپ میں جس طرح انقلاب ہوا، اس قسم کے انقلاب کی وہ یہاں توقعات باندھے بیٹھے ہیں۔ لیکن ہمارا ملک یورپ سے بہت سے بنیادی امور میں مختلف ہے۔ اُن کے یہاں تعلیم عمومی، پریس کی ترقی اور فوجی خدمت کے لزوم نے انقلاب کے لئے میدان صاف کر دیا تھا۔ ہمارے عوام علم سے بے بہرہ، اور فوجی ڈسپلن سے ہزاروں کوس دور ہیں۔ لہذا وہ یورپ کے طریقے پر انقلاب کو کبھی سنبھال نہیں سکتے۔

اس طرح کے انقلاب کا ابھی اسی زمانہ میں دو بار تجربہ ہو چکا ہے۔ پہلے تجربہ روس میں ہوا۔ روس کی عمومی تعلیم اچھی نہیں تھی۔ تاہم انقلاب کے داعیوں نے طے کر لیا۔ کہ وہ اس کو کامیاب بنا کر دکھا دیں گے، مگر وہ اس میں سو فی صدی ناکام ہوئے۔ چنانچہ شکست کے بعد انہوں نے عوام کی تعلیم کو اساس قرار دے کر جبر اور ڈکٹیٹر شپ سے کام لے کر ایک حصہ ملک کو تیار کیا۔ اور اس کے مناسب انقلابی نظام بھی تبدیل کر دیا۔ تب کہیں جا کر وہ حکومت چلا سکے، جو لوگ کارل مارکس کے متبع ہیں، وہ لینن کے کام کو کبھی تعریف کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ لینن نے بہت سی ایسی تبدیلیاں منظور کر لی تھیں، جو اس کے ملک کے لئے ضروری تھیں۔ روس کے انقلاب کو ہندوستان میں بیٹھ کر پڑھنے والے ایسے امور سے کبھی واقف نہیں ہو سکتے۔

دوسری بار انقلاب ترکی میں ہوا، روسی عوام میں فی الجملہ ابتدائی تعلیم تھی، ترکی اس سے بالکل بے بہرہ تھا۔ چنانچہ مصطفےٰ کمال مجبور تھا کہ عربی زبان اور عربی رسم الخط کو قطعی طور پر ترک کر کے اپنی اہل ملک کو ان کی مادری زبان رومن حروف میں سکھائے۔ چنانچہ وہ اپنی ڈکٹیٹر شپ کے زور سے بہت جلد ایک پارٹی بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

لیکن ہمارا ملک روس اور ترکی ہر دو سے پیچھے ہے۔ بیشک ہمارے ہاں ایک مختصر متوسط طبقہ پیدا ہو چکا ہے۔ جو یورپ کے تمام علوم جانتا ہے اور وہی کانگرس کو چلا رہا ہے اور وہی انقلاب کی توقعات باندھے

ہوئے ہے۔ مگر انقلاب عوام کی مشارکت کے بغیر کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ اور یہ لوگ ہیں کہ ہندوستانی عوام کے نزدیک جانا بھی پسند نہیں کرتے۔

اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی ان تمام چیزوں کو سمجھتے ہیں۔ مگر وہ گجرات سے باہر ہندوستان کے کسی ٹکڑے میں اپنی طرز کی حکومت نہیں بنا سکتے۔ گاندھی جی ادنیٰ طبقہ کی خدمت اور تربیت کے لئے متوسط طبقے کو (جوان کو لیڈر مانتا ہے) متوجہ کر سکتے ہیں ہم اس کی پوری قدر کرتے ہیں۔ مگر یہ انقلاب کے مبادی میں معمولی درجہ کی چیز ہے، انسانیت کے مفادِ عامہ کے لئے اپنی جان قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرنا انقلاب کی اصل اساس ہے۔ یہ چیز گاندھی جی کی اپنی شخصیت میں علی وجہ الکمال موجود ہے۔ لیکن ان کے معتقدوں میں شاید فی صدی ایک میں ہو، اس لئے ہم گاندھی پارٹی کے مصنوعی شور وشغب سے متاثر نہیں ہوتے۔

ہم اپنے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق انسانیت کی اصلاح کے لئے قربانی کا جذبہ نہایت آسانی سے پیدا کر سکتے ہیں۔ قرآن عظیم کا یہ مقصد معین کرنے میں امام ولی اللہ ہماری نظر میں منفرد ہیں۔ اس لئے ہم ان کے سوا کسی کی تفسیر کو قبول نہیں کر سکتے۔

ہم جس طرح اپنے نوجوانوں کو قرآن عظیم کی تعلیم سے اس مقصد عالی پر لے آتے ہیں، اسی طرح اگر ہندو تعلیم یافتہ نوجوان ہم پر اعتماد کرے۔ تو ہم اس کو ولی اللہ فلاسفی پڑھا کر بھگوت گیتا کی تعلیم سے اسی مقصد پر لے آئیں گے، یہی طرز ہمارا بائیبل ماننے والی اقوام کے

ساتھ رہے گا۔ ہم ولی اللہ فلاسفی پر ساری بائیبل پڑھا کر انسانیت عامہ کے مفاد پر ان کو جمع کر دیں گے۔

الغرض مولینا شیخ الہند رحؒ ہمیں تین چیزیں بتا گئے ہیں۔ اوّل یہ کہ آپ نے درجہ تکمیل میں شاہ ولی اللہ کا فلسفہ اور مولینا محمد قاسم رحؒ کی حکمت داخل کرائی۔ دوؔم سیاسی تحریک میں دیوبندی جماعت کے ساتھ علی گڑھ پارٹی کو مساوی درجہ پر شامل کرنا منظور کر لیا۔ سوؔم یہ کہ انڈین نیشنل کانگرس کے اندر جا کر بیرونی ممالک اسلامیہ کی سیاسیات سے علیحدگی اختیار کر کے کام کیا جائے۔

ہمارے اس مقولہ میں کہ "پہلے یورپین بنو" سے اصل مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے اندر جنگی طاقت اور حربی قوت پیدا کریں۔ شاہ ولی اللہ اپنی کتاب "خیر کثیر" صفحہ ۱۱۳ میں لکھتے ہیں کہ حکومت چلانے کی استعداد مسلمانان ہند سے[1] افغانوں کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ اور اس سلسلہ میں شاہ عبدالعزیز نے ایک خواب[1] بھی دیکھا تھا۔ جس میں امیر المومنین حضرت علیؓ نے انھیں پٹھانوں کی طرف توجہ کرنے کی تلقین فرمائی تھی۔ دراصل اس سے مراد فقط جنگی طاقت اور حربی قوت ہے۔ افغانوں میں چونکہ لڑنا اور مردانگی موجود ہے۔ اس لئے اُن کو ایک عالم منظم کر کے اسلامی قومی حکومت کی فوج بنا سکتا تھا۔ مگر جس قوم سے لڑنے مرنے کی طاقت سلب کر لی گئی ہو، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ آج اس کی مثال ہندو بنیئے سے ملتی ہے۔ وہ بڑا حساب دان ہے۔ بڑا مالدار ہے، مگر وہ حکومت نہیں سنبھال سکتا ہے۔ اور ایک معمولی سپاہی

---

[1] تفصیل ملاحظہ ہو ضمیمہ جات میں

اس کی جائداد پر قبضہ کر کے مالک بن سکتا ہے۔ اگر ہندوستانی قومیں انگریزی فوج میں ملازمت کر کے یورپین طریقہ پر سپاہی بننا نہ سیکھیں گی، تو اُن کے لئے ہندوستان کی آئندہ حکومت کو سنبھالنا ناممکن ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں باوجود ہزارہا اختلافات کے سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کی ہمیشہ تائید کرتا ہوں کہ وہ میری قوم کو فوج میں بھیجنے کا حامی ہے۔ سنو! میں نوّے ۹۰ فی صدی افراد جنگ میں مر سکتے ہیں، مگر دس جو واپس آئیں گے، وہ ہمارا اصلی سرمایہ ہوگا۔ اس لئے ہم تعلیمافتہ طبقہ کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ یورپین طریقے پر فنون حرب سیکھیں۔ مستقبل میں جب ہندوستان کو ڈومنین اسٹیٹس مل جائے گا۔ تو اسوقت وہ اپنے کاشتکاروں کو فوجی تعلیم دے سکیں گے۔ اس کے لئے کاشتکاروں کو بھی یورپین بنانے پڑے گا! اور اگر قومی زندگی میں کاشتکاروں کی اہمیت کا انکار کیا گیا تو ان کا وجود ہی بیکار ہو جائیگا۔ اس لئے ہم اپنی قوم سے وہ لعنت کے جراثیم جو مسجدوں اور خانقاہوں سے پھیلتے ہیں، اور قوم کو نامردی سکھانے کا نام انہوں نے اسلام رکھا ہوا ہے۔ مذکورہ وقت آنے سے پہلے .... ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

ہم عام لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی مادری زبانیں انگریزی حروف میں لکھنا پڑھنا شروع کر دیں۔ اور اپنے خاندان کے کسی فرد کو عام اس سے کہ عورت ہو یا مرد ایسا نہ چھوڑیں کہ وہ اپنی زبان یورپین حروف میں نہ لکھ سکتا ہو۔ اس کے بعد اس کو ترکوں کی طرح زندگی بسر کرنا سکھانا چاہیئے۔ ترکوں میں بھی اسی طرح بے ایمان لوگ موجود ہیں۔ جیسے ہمارے

یہاں ہیں۔ مگر ترکی قوم کے ایمان میں مجموعی طور پر جسے شبہ ہو سکتا ہے، وہ احمق ہے۔ اب ترکوں نے اپنا قومی طریقہ "یورپین ازم" بنا لیا ہے۔ ہم اس مسلم قوم کے ترقی یافتہ نمونے پر اپنی قوم کو تیار کرنا چاہتے ہیں۔ ان حقائق سے ہمارے بڑے بڑے عالم ناواقف ہیں، انکو واقف کرنیکی اشد ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ نہایت نرم زبان میں انکو یہ چیزیں سمجھا دی جائیں۔ مگر ہماری قوم میں ایک ضدی عنصر موجود ہے۔ وہ مسلمانوں کی ہر تباہی کو قبول کر سکتا ہے۔ مگر اپنے طرز میں تبدیلی کا روادار نہیں بنتا۔ ہم انہیں منہ نہیں لگاتے۔ اور جب موقعہ ملے گا ہم انھیں ختم کر دیں گے۔ یہ کہہ کر میں صرف اپنی ذہنیت کی ترجمانی نہیں کر رہا مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان میں انقلاب آئے گا۔ میں اصل میں اس انقلابی جماعت کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ میں نے روس میں اور ترکی میں انقلابی جماعتوں کا کافی تجربہ کیا ہے۔ وہ سب کے سب ایک ہی مسلک پر چل رہے ہیں۔ انکی زبانیں مختلف ہیں، انکے مذاہب مختلف ہیں۔ مگر معاشرت کا طریقہ سب میں مشترک ہے۔

ہمارے سمجھ دار طبقے کو ہماری طرح جب تک کہ ہم ہندوستان میں تھے۔ یہاں ایک شبہ دامن گیر رہتا ہے۔ اور وہ یہ کہ انگریزی کالجوں اور انگریزی دفاتر سے ایک نوجوان سوائے یورپین فیشن کے اور کچھ نہیں سیکھتا۔ وہ ملازمت سے روپیہ کماتا ہے۔ اور اپنی ضرورتیں اس قدر بڑھاتا ہے کہ باپ دادا کا اندوختہ اس فیشن پرستی کی نذر کر کے ختم کر دیتا ہے۔ پھر نزاکت، بزدلی نامردی کا پورا پورا نمونہ بن جاتا ہے۔ اور دن رات اس تعریف میں لگا رہتا ہے۔ کہ یورپین بنے بغیر انسان انسان نہیں کہلا سکتا۔ ہمیں خود اس

گروہ سے کافی واسطہ پڑتا رہا۔ اور ہم اپنی پرانی ہندوستانی زندگی میں اُن سے متنفر رہے۔ اور اپنی قوم کو اس سے بچانے کے لئے کوشش کرنا ایمانی فرض جانتے تھے۔ اب ہماری ذہنیت یہ بن چکی ہے کہ ہم ان نازک مزاج نازک اندام افراد کے بجائے اپنے کاشتکاروں کو یورپین بنائیں۔ ہمارا "یورپین ازم" کا پہلا تجربہ غلط اور غیر مفید ثابت ہوا۔ ہم اب اپنی قوم کے کارکن عنصر کو جو ہمارے ملکوں میں عموماً کاشتکار رہے، اقتصادی مصیبتوں میں گرفتار دیکھتے ہیں۔ اُن کو اِن مصائب سے نجات دلانا قوم کی ہستی کے لئے ضروری ہے۔ اور اُن کی نجات کا کوئی ذریعہ نہیں، سوائے اس کے کہ وہ اپنی اصلاح کے لئے خود کھڑے ہوں۔ مگر اس اصلاح سے پیشتر اُن کو تعلیم دینا ضروری ہے، سرمایہ دار حکومت نے تعلیم چند افراد کے لئے مخصوص کر رکھی ہے۔ اب یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے کاشتکاروں کو کالج کے گریجوایٹ بنا سکیں مگر یورپ کے طریقے پر کاشتکاروں کو تعلیم یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن سب سے پہلے انھیں اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھنا چاہیئے۔ اس کے لئے ہمارا عربی رسم الخط ایک قوی مانع ہے۔ ایک ایسے انسان کو جو چوبیس گھنٹے کام میں مصروف رہتا ہے۔ یہ خط سکھانا جو ایک ایک حرف کی کئی شکلیں پیش کرتا ہے سیکھنے اور سکھانے والے دونوں کے لئے بیحد دشوار ہے۔ رومن حروف جو علیحدہ علیحدہ لکھے جاتے ہیں ان کی وجہ سے ایک دفعہ حروف شناسی کے بعد ساری عمر کے لئے انسان فارغ ہو جاتا ہے، ہم ٹائپ رائیٹر مشین رکھ کر اپنے بچوں کو چند گھنٹوں میں اپنی مادری زبان لکھنا پڑھنا

سکھا سکتے ہیں۔ سپاہی بننے کے لئے اتنی ہی تعلیم ضروری ہے۔ اس تعلیم پر وہ مصارف بھی عائد نہیں ہوتے جو کالج میں گریجوایٹ بننے پر واجب آتے ہیں اور نہ انسان فیشن پرستی کا شکار ہو کر نزاکت اور بزدلی کا نشانہ بن سکتا ہے۔

جس وقت ہم اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تو ہر زبان کے لئے ایک مرکزی پریس تعلیم دینے کے لئے کافی ہے۔ اس سے ماہوار رسالے نکلیں گے۔ ہفتہ وار پرچے ہوں گے، روزنامے ہوں گے۔ اور ہر شخص اپنی زبان میں گھر بیٹھے پڑھ سکے گا۔ قوموں کو اس طرح تعلیم دینے کی سہولت جس طرح اس عہد میں موجود ہے، پہلے زمانے میں کسی کے خیال میں بھی نہیں تھی۔ اس لئے اس سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

مذکورہ بالا دنیاوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میرا اپنا ذاتی دوسرا پروگرام بھی ہے۔ میں کم از کم قرآن عظیم کی چالیس سورتوں کی تفسیر کر کے اس کو قوم کی مادری زبان میں پریس کے ذریعے ان کے گھروں میں پہنچا دوں گا۔ اس کے بعد ان کو کوئی "دجّال" دین سے بھٹکا نہ سکے گا۔ سوائے ان لوگوں کے جو دجالیت پر مطبوع ہوئے ہوں۔ میری زندگی کا آخری مقصد یہی آخری چیز ہے۔ مگر یہ اس پہلی تعلیم پر موقوف ہے۔ اسی لئے میں اس پر زور دیتا ہوں۔ اب اس سے بہتر کوئی اور پروگرام ہو تو میرے مخاطب اُسے میرے سامنے لائیں، میں اس کو مان لوں گا۔

مسلم لیگ کے اراکین کی سکیمیں جو ساری عمر انگریزی دفتروں

ہیں کام کرتے رہے یا کسی عالم کی جو سلف کے طریقے کا ماہر ہے۔ مگر اس یورپ کا ایک حرف نہیں جانتا۔ جس نے تمام اسلامی سلطنتوں کو ہضم کر لیا ہے۔ چنانچہ ان کے وہ پروگرام جو خالد بن ولید اور فاروق اعظم کا نام لے کر پیش کئے جاتے ہیں۔ میں نہیں سننا چاہتا، فاروق اعظم کو سمجھنے کے لئے کم از کم شاہ ولی اللہ کی حکمت کا سمجھنا ضروری ہے۔ اگر کوئی ان کی حکمت کا ایک صفحہ غور سے پڑھے گا۔ تو وہ یورپ کو سب سے پہلے دیکھے گا۔ یہ سلف کا نام لینے والے بیچارے عموماً حقیقت سے بے خبر ہیں۔

ضمیمہ جات

لے آصف جاہ اوّل

حضور نظام کے جد امجد ہیں۔ آپ سلطان عالمگیر کے دربار کے پروردہ اور سر برآوردہ تھے۔ عالمگیر کی سلطنت ختم ہو گئی، مگر آصف جاہ کی اولاد اب تک حکمران ہے۔ آصف جاہ نے دہلی کی سلطنت کو تقویت دینے کے لئے سکیم تیار کی تھی۔ وہ اپنی عقل اور دانش کو دربارِ محمد شاہ کی تقویت کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہے۔ اس پر انھوں نے اپنی عقل کو خود اپنی شخصی ترقی اور ترفع کے لئے لگا دیا۔ جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ محمد شاہ ابتدا میں ان کا طرفدار تھا۔ مگر بد اندیش درباریوں نے بادشاہ کو آصف جاہ سے بدظن کر دیا۔ بعد ازاں اُس کو خود اپنے لئے جو کچھ کرنا تھا کیا۔ گو پہلے وہ اپنی تمام قوتیں دربار کے لئے صرف کرنا چاہتا تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی مقدمہ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۱ میں لکھتے ہیں: شاہ عبدالرحیم کے مکاتیب کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے کتبخانہ

میں میری نظر سے گزرا۔ اُس میں آپ کا ایک خط نظام الملک آصف جاہ اوّل کے نام ہے۔ جس میں انہوں نے نواب مرحوم کو مرہٹوں سے جہاد کرنے کی ترغیب دی ہے۔" آصف جاہ کے حالات اور اس کے کارناموں کے لئے سیر المتاخرین اور تاریخ ہند از ذکاء اللہ جلد نہم کافی ہے۔ سن وفات ۱۱۶۱ھ

۵۔ مرزا مظہر جانجاناں

آپ کا پورا نام شمس الدین حبیب اللہ ہے۔ موصوف علوی سادات کے بلند مرتبہ خانوادے سے تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد کا شمار اُمرائے شاہی میں سے ہوتا تھا، اور تیموری سلاطین سے بھی آپ کی قرابت تھی۔ آپ ہر فن اور تمام علوم ظاہری میں بہرۂ کامل رکھتے تھے۔ چہارشنبہ، ۷ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ کا واقعہ ہے کہ رات کا ایک حصہ گزر چکا تھا کہ آپ کی خانقاہ پر چند لوگوں نے دستک دی۔ خادم نے عرض کیا کہ کچھ لوگ زیارت کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ انہیں آنے دو۔ چنانچہ تین آدمی اندر آئے۔ ان میں سے ایک مغل زادہ تھا جس نے چھوٹتے ہی آپ پر حملہ کیا۔ اور دل کے قریب کاری زخم لگایا۔ اس کے بعد تین روز تک آپ زندہ رہے۔ اور جمعہ کی شام کو جان جان آفریں کے سپرد کر دی (خزینۃ الاصفیاء)

(مولانا کے غیر مطبوعہ مسودہ کتاب) "التمہید" میں ہے "امام ربانی کے طریقہ مجددیہ کے اکابر میں سے ایک امام شمس الدین حبیب اللہ محمد مظہر جانجاناں ہیں۔ آپ شاہ ولی اللہ کے ہم عصر تھے۔ شیخ محسن اپنی کتاب "یانع جنی" میں امام ربانی کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں کہ ان کے بعد آنے والے اُن کے

جلیل القدر اصحاب میں سے ایک شیخ شمس الدین المظہر معزز مرزا جانجاناں شہید دہلوی ہیں۔ آپ حضرت علیؓ کے صاحبزادہ محمد بن الحنیفہ کی اولاد میں سے تھے۔ موصوف بے شمار فضیلتوں کے حامل تھے۔ آپ نے الحاج محمد افضل سیالکوٹی سے حدیث پڑھی تھی۔ اور مجددی طریقہ امام ربانی کے بڑے عالی مرتبت پیروؤں سے حاصل کیا تھا۔ اتباعِ سنت اور کشفی قوت میں آپ کا بلند مقام تھا۔ موصوف کے استاد شیخ سیالکوٹی، امام ولی اللہ اور الحاج فاخر آلہ آبادی ایسے ائمہ تصوف اور محدثین نے آپ کے علم و فضل اور جلالت شان کی شہادت دی ہے، مشہور محدث محمد حیات سندھی ثم مدنی کا قول ہے کہ اگر کوئی حدیث فقہ حنفی کے معمول کے خلاف وارد ہو۔ اور مرزا جانجاناں اس حدیث کی توثیق کریں تو اس کے باوجود بھی اس حدیث پر عمل کر لینا چاہئے۔ آپ نے عاشورہ محرم میں شہادت پائی۔ آپ کی شہادت کی تاریخ عاش حمیداً و مات شہیداً" مشہور حدیث سے نکالی گئی ہے، مرزا جانجاناں کے جلیل القدر اصحاب میں سے قاضی ثناء اللہ پانی پتی ثم عثمانی ہیں۔ آپ پانی پت کے رہنے والے تھے، اور بہت بڑے فقیہہ، اصولی، زاہد اور مجتہد تھے۔ آپ نے حنفی فقہ میں بعض مسائل کا خود استخراج فرمایا تھا۔ فقہ، تفسیر اور زہد کے مسائل پر آپ کی بعض مشہور تصنیفات بھی ہیں۔ موصوف کے استاد مرزا جانجاناں آپ پر فخر کیا کرتے تھے۔

مولینا "التمہید" میں اس کے بعد لکھتے ہیں کہ مرزا جانجاناں مظہر اور امام ولی اللہ آپس میں دو بھائیوں کی طرح تھے، جو ایک دوسرے سے راضی

ہوں۔ اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔ سرزمین دہلی اب تک ان دو بزرگوں پر نازاں ہے۔ امام محمد مظہر جانجاناں نے دہلی کے کسی شیعہ امیر کے نوکر کے ہاتھ سے ۱۱۹۵ھ میں شہادت پائی۔

آپ کا ایک شعر ہے

بہ لوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے

کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

امیر الروایات میں ہے کہ حضرت مرزا صاحب کے قتل میں نجف علی خاں حاکم دہلی کا ہاتھ تھا جو مذہباً رافضی تھا۔

بحوالہ ش، م صفحہ ۲۷

۳۔ مجتہدانہ کمال۔

تجدیدِ انقلاب کے لیے حدیث و فقہ میں "مجتہدانہ کمال" ضروری امر ہے۔ اجتہاد کے متعلق شاہ ولی اللہ "مصفیٰ" میں لکھتے ہیں: "ہر زمانہ میں اجتہاد فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن یہاں اجتہاد سے مقصود اجتہاد مستقل نہیں۔ جیسا کہ امام شافعی کا اجتہاد تھا۔۔۔۔۔۔۔ ہمارا یہ کہنا کہ ہر زمانہ میں اجتہاد فرض ہے، اس کا دراصل مطلب یہ ہے کہ چونکہ مسائل آئے دن نئے سے نئے پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور ان کے بارے میں احکام الٰہی کا جاننا ضروری ہے، اور جو کچھ پہلے مدوّن اور مرتب ہو چکا ہے وہ کافی نہیں ہوتا۔ اور پھر اس میں بھی بہت اختلاف ہوتا ہے۔ اور نیز یہ اختلافات اسوقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک دلائل کی طرف رجوع نہ کیا جائے، اور مشکل یہ ہوتی ہے

کہ ان دلائل کا سلسلہ اصل مجتہدین تک لے جایا نہیں جا سکتا۔ ان حالات میں اس کے سوا اور کوئی صورت ممکن نہیں ہوتی کہ مسائل کو اجتہاد کے اصولوں پر پرکھا جائے۔"

جب تک کوئی انسان اپنے فکر پر مستقل اعتماد نہ رکھتا ہو، وہ کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔ استقرار فکر کے تین درجہ ہیں۔ اوّل شریعیات میں خلافت راشدہ کو امام بنانا ضروری ہے جو شخص اپنے آپ کو اس سے بھی مستثنیٰ کرے۔ اور قرآن حکیم کو اپنے مستقل فکر سے حل کرنا چاہیئے، اُسے ہم مجتہدین میں شمار نہیں کرتے۔ وہ در اصل اپنی موروثی ذہنیت کو قرآن کا لباس پہنا دیتا ہے۔ خلافتِ راشدہ کا اتباع کرنے والا ایک حکیم اگر اپنا مستقل فکر رکھتا ہے اور اس کے فکر میں اور خلافت راشدہ میں کوئی اور واسطہ نہیں، اور وہ خلافت راشدہ کے دستور العمل کو پڑھ کر اپنے فکر سے تطبیق دے لیتا ہے تو یہ ہے مجتہد مطلق مستقل۔ اس کی مثال ائمہ ثلاثہ ہیں۔ کیونکہ امام احمد کو ہم امام شافعی کے اتباع میں شمار کرتے ہیں۔ اگر امام شافعی کے مذہب کے ساتھ امام احمد کا مذہب ملا کر مدوّن کر دیا جائے تو یہ ایک بڑی چیز ثابت ہوگا۔ جیسے صاحبین کا مذہب، امام ابو حنیفہ کے مذہب سے مل کر بہت بڑی چیز بن گیا ہے۔ اور اُس نے چار دانگ عالم کو مسخر کر رکھا ہے۔

مولانا "التمہید" میں لکھتے ہیں ہمارے نزدیک امام احمد کے مذہب کی حیثیت امام شافعی کے مذہب کے تتمہ کی سی ہے۔ اس بارے میں شاہ ولی اللہ اپنی کتاب "الانصاف" میں فرماتے ہیں۔ امام احمد کا مذہب امام شافعی

کے مذہب کے ساتھ اسی طرح متعلق ہے جس طرح امام ابو یوسف اور امام محمد کا مذہب امام ابو حنیفہ کے ساتھ۔ البتہ جس طرح ان دونو صاحبوں کا مذہب امام ابو حنیفہ کے مذہب کے ساتھ مدون کیا گیا ہے، اسی طرح امام احمد کا مذہب امام شافعی کے ساتھ جمع نہیں کیا گیا۔ اور اس لئے ان دونو کا شمار الگ الگ کیا جانے لگا اور اب بھی اگر کوئی کوشش کرے تو ان دونو مذہبوں کو باہم مدون کرنا زیادہ مشکل نہیں۔

مولٰنا لکھتے ہیں کہ ہم توقع رکھتے ہیں کہ حنبلی مذہب کے فقہا، امام شافعی کے مذہب میں تبحر حاصل کریں گے۔ اور اسی طرح شافعی مذہب کے فقہا حنبلی مذہب کے متبحر ہوں گے۔ اور اسی طرح اگر حنفی مذہب والے اور مالکی مذہب والے بھی دونو آپس میں ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں، تو اُمتِ اسلامیہ کے لئے اس میں بڑا فائدہ ہوگا۔

استقرارِ فکر کا دوسرا درجہ یہ ہے۔ کہ ایک مجتہد مستقل کو استاد مان کر یہ فن اس سے سیکھ لیا جائے۔ مگر اُستاد کی طرح اس عالم کا اعتماد بھی براہ راست خلافتِ راشدہ پر ہو۔ جیسے صاحبین۔ ایسے ائمہ کو مجتہد منتسب کہا جاتا ہے، یہ دوسرا درجہ ہے اجتہاد کا۔ اور انقلاب کے لئے کم از کم اس درجہ کا مجتہد ہونا ضروری ہے۔

استقرار فکر کا ایک تیسرا درجہ تجویز کیا گیا ہے۔ جسے مجتہد فی المذہب کہتے ہیں، اس کا تعلق خلافت راشدہ سے نہیں ہوتا۔ مجتہد مستقل اور اُس کے اتباع میں جتنے مجتہد منتسب پیدا ہوئے، اُن کے اختلافات کو یہ ایک اصول

کے اندر حل کر دیتا ہے۔ اس لئے ایک مذہب کی کتابیں پڑھانے میں یہ استاد کامل ہوتا ہے۔ نیز یہ شخص داخلی انتظام کے لئے قاضی مفتی بننے کے لئے بہت کارآمد ہے۔ یہی نظام داخلی کو مستحکم بنا دیتا ہے جیسے حنفیہ میں شمس الائمہ سرخسی وغیرہ ائمہ۔ حنفی فقہ میں جس قدر مجتہد گزرے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ خراسان کے ایک ایک گاؤں میں دس دس مجتہد فی المذہب گزرے ہیں، مذہب حنفی کی بقا اور استحکام کی یہی وجہ ہے سلطنتیں مٹ گئیں مگر عوام میں مذہب حنفی موجود و محفوظ ہے، اور اس کی مخالفت ترک اسلام کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔

۴۔ شاہ صاحب کا الہامی خواب

اصل خواب "فیوض الحرمین" صفحہ ۸۹ میں مذکور ہے۔ حضرت مولانا کتاب التمہید (حصہ اردو) صفحہ ۲۰ میں فرماتے ہیں، استبدادی حکومتوں کا خاصہ ہے کہ حکمران کے ماسوا کوئی شخص سیاسیات پر رائے زنی نہیں کر سکتا۔ اس لئے حکماء اسلام کا ایک طبقہ جو شعر و شاعری کا مذاق رکھتا ہے، اپنی منظوم تصانیف میں قصص و حکایات، یا مدائح و نصائح کی صورت میں اپنی رائے ظاہر کرتا ہے، اور جنہیں اس طرح اظہار خیالات کا موقعہ نہیں ملتا، ان کے افکار صادقہ کا سلسلہ واقعات مستقبلہ کی صورت اختیار کر کے خواب میں نظر آتا ہے۔ ان کے معتقد اس بشارت کو سنتے ہیں، اور اس کی تعبیر میں غور کرتے ہیں، اور حقیقت واقعہ عریاں ہو کر نظر آنے لگتی ہے۔

شاہ صاحب نے اپنا انقلابی نظریہ حجاز میں مکمل کر لیا تھا۔ جسے آپ نے "فیوض الحرمین" میں ایک خواب کی شکل میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں شب جمعہ ۲۱ ذیقعدہ

۱۱۴۴ھ کو میں نے مکہ معظمہ میں خواب دیکھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس زمانہ کا نظام قائم رکھنے میں ایک واسطہ بنایا ہے۔ میں نے دیکھا کہ کفار کا سردار مسلمانوں کے شہروں پر غالب آگیا ہے۔ اس نے ان کے اموال لوٹ لئے۔ اور انھیں قید کر لیا اور اجمیر جیسے شہر میں کفر کے خصوصی احکام جاری کر دیئے، اور اسلامی قانون کے خاص کام ممنوع قرار دے۔ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے متاثر ہو کر میں غضب سے بھر گیا۔ اور میرے غضب کا اثر اس ہجوم میں بھی پھیل گیا جو میرے گرد جمع ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس وقت خدا تعالیٰ کی رضا کس طرح ہو سکتی ہے۔ میں نے جواباً کہا "فکّ کلّ نظامٍ" تمام بوسیدہ نظاموں کو توڑ دو۔ اس کے بعد وہ ہجوم آپس میں جنگ شروع کر دیتا ہے، پھر میں ایک شہر کے قریب پہنچا تاکہ اس کو برباد کر دوں۔ ادھر وہ لوگ بھی میرے پیچھے پیچھے چلے آئے اور لگاتار شہروں کو برباد کرتے ہوئے اجمیر پہنچ گئے۔ یہاں میں نے دیکھا کہ ان لوگوں نے کفار کے سردار کو ذبح کر ڈالا۔ اور اس کی رگ ہائے گردن سے خون بڑے زور سے بہہ رہا ہے۔

اس خواب کی تعبیر میں غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کی شکست کی طرف اشارہ ہے۔ اور شاہ ولی اللہ ایک طرح پر اس کے سرانجام دینے کا واسطہ ہیں۔ اجمیر کا ذکر اس لئے آتا ہے کہ دہلی کا روحانی مرکز اجمیر تھا۔ خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ اجمیر میں تشریف لائے اور یہیں سے اشاعت اسلام کا کام شروع کیا جس کے نتیجہ میں دہلی فتح ہوئی۔

اس خواب کے دو سال بعد ۱۱۴۶ھ میں باجی راؤ شمالی ہند پر حملہ آور ہوا۔ ادھر ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ کی یلغار سے تمام سابقہ انتظامات کمزور ہونا شروع ہوئے۔ نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اس سلسلہ کو جاری رکھا جس میں مسلمانوں کی خانہ جنگی اور ان کے نظام سلطنت کی بوسیدگی ظاہر کرنے کے ماسوا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ مگر اسی احمد شاہ نے ۹ ذیقعدہ ۱۱۷۴ھ میں پانی پت پر مرہٹوں کا خاتمہ کر دیا۔

ہندوستان کے جن مسلمان امیروں نے احمد شاہ کو اس حملہ کی دعوت دی تھی، ان میں نواب نجیب الدولہ پیش پیش تھے۔ یہ تاریخی حقیقت سب کو معلوم ہے۔ کہ نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص مسترشدین میں تھے۔

الغرض اس واقعہ کے قاعدے "فُکَّ کُلِّ نظامٍ" کو شاہ ولی اللہ نے اپنے انقلابی نظریے کا عنوان قرار دیا۔ اور تفسیر وحدیث وفقہ وتصوف کی تمام کتابوں میں جو پچاس کے قریب ہیں، مناسب مواقع پر اجتماع کے فساد کی تفصیل اور انقلاب کی ضرورت پر کافی بسط سے بحث کی ہے۔

۵ شاہ صاحب کی مستقل امامت

شاہ ولی اللہ کے اصول کو چھوڑ کر کوئی شخص اسلام کی علمی طاقت کو محفوظ رکھنا چاہے تو کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ نیز ان کے سیاسی اصول ترک کر کے حکومت بنانا چاہے گا تو یقیناً ناکام رہے گا۔ "تفہیمات الٰہیہ" صفحہ ۱۰۱ میں ہے کہ مجھے "تقرب الی اللہ کا ایک نیا طریقہ عطا کیا گیا ہے، جس سے تمام پرانے طریقے منسوخ ہو گئے ہیں۔ لوگوں کو پرانے طریقوں سے محبت ہے جس

سے ان کو ایک قسم کی لذت محسوس ہوتی ہے، مگر تقرب الی اللہ ان طریقوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

یہاں پر اس قدر تنبیہہ کرنے کی ضرورت ہے کہ امام ولی اللہ اپنے طریقے میں خدا یاد کرنے کے اشغال اور حکومت بنانے کے قوانین، ہر دو چیزوں کو ایک مرتبہ پر جمع کر دیتے ہیں، انہوں نے حکومت کا نام خلافتِ ظاہرہ رکھا ہے، اور حکومت پیدا کرنے والی جماعت کا نام خلافت باطنہ تجویز کیا ہے۔ آج کی اصطلاح میں اگر اس کا ترجمہ کیا جائے، تو پہلے درجے کو گورنمنٹ کہا جائے گا۔ اور دوسرے درجے کو وہ پولٹیکل پارٹی جو اس گورنمنٹ کو پیدا کرتی ہے۔ "فیوض الحرمین"

یہ دونوں چیزیں سیاست میں آگے پیچھے نہیں کی جا سکتیں۔ بلکہ مساوی عزت کی مستحق ہیں۔ شاہ صاحب ان کے لئے سیاست کا وہ خصوصی لفظ جو اسلام میں مستعمل تھا، یعنی خلافت استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کے دو حصے بنا کر دونوں جماعتوں کو ایک نقطے پر جمع کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی پولیٹیکل پارٹی کے لئے ذکر و فکر ضروری ہے۔ ورنہ وہ دینی حکومت کبھی پیدا نہیں کر سکے گی۔

اب وہ جس وقت "اپنا طریقہ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس میں ان کی ساری تحریک علمی ہو یا اخلاقی وجدانی ہو یا سیاسی سب کی سب یکساں داخل ہیں۔

اس تنبیہہ کے بعد ہمارا یہ کہنا صحیح ہو گا کہ شاہ صاحب کے خلاف کوئی طریقہ ذکر و فکر کا مقرب الی اللہ نہیں ہو گا، اور اسی طرح شاہ صاحب کے اصول

چھوڑ کر کوئی سیاسی تحریک حکومت ہو یا حکومت پیدا کرنے والی جماعت وہ دینی حکومت پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوگی۔ شاہ صاحب کے مذکورہ ذیل جملوں کا مطلب ہم یہی سمجھتے ہیں کہ طریقت واشغال۔ اور مذہب وسیاست سب چیزیں ان ہی کے اتباع میں تقرب الی اللہ کا باعث بن سکتی ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے" اس مذہب کے بعد تو کوئی ایسا مذہب نہیں دیکھے گا۔ اور اُس کے طریقۂ سلوک کے ماسوا تجھے کوئی طریقہ نظر نہ آئے گا۔ جو" جذب" کی اصل روح پر مشتمل ہو۔ بے شک بہت سے ایسے اہل طُرق اور اصحاب مذاہب ضرور ہیں، جو اپنے طرق اور مذہب کے پابند ہیں۔ اور جن سلوک کی راہوں پر وہ گام زن ہیں، وہ ایک حد تک مفید اور کار آمد بھی ہیں۔ لیکن "جذب" کی صحیح روح ان کے ہاں مفقود ہے۔ یہ ہے وہ روز قیامت جس سلسلہ میں کہ اس "وصی" کو مبعوث کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا، اور اس کے عالم وجود میں آنے کے لئے یہ شرط کی گئی تھی صفحہ ۱/۸۱ تفہیمات

الغرض یہ تصریحات بظاہر طریقت کے لئے لکھی گئیں۔ مگر ہماری سمجھ میں شاہ ولی اللہ سیاسی اصول میں بھی دنیا بھر کے امام ہیں۔ ہندوستان تو ایک طرف رہا، یورپ میں بھی ان کے اصول سے ہٹ کر کوئی حکومت نہیں رہ سکتی۔ ہم اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھوا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کی فضا اس کے موافق نہیں ہے۔

۵۶ مدرسہ شاہ ولی اللہ

شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد کی وفات کے بعد "مدرسہ رحیمیہ"

ہیں جس کی بنیاد شاہ عبدالرحیم ڈال گئے تھے طلبہ کو درس دینا شروع کیا۔ بارہویں صدی کے آغاز اور گیارہویں کے اختتام پر شاہ عبدالرحیم نے پُرانی دہلی میں اس مقام پر ایک مدرسہ قائم کیا۔ جواب مہندیوں کے نام سے مشہور ہے اور اس کا نام مدرسہ رحیمیہ رکھا، حیات ولی صفحہ ۲۲

جب شاہ صاحب کے علمی کمال کا شہرہ بڑھا اور طلبہ اطراف واکناف سے آنے لگے تو مدرسہ رحیمیہ ان کے لئے ناکافی ثابت ہوا۔ سلطان محمد شاہ نے امام ولی اللہ کو بُلا کر شہر میں ایک عالیشان مکان دے کر دار الحدیث کا اس میں افتتاح کرایا۔ اس کے بعد قدیم جگہ غیر آباد ہو گئی۔ یہ نیا مدرسہ کسی زمانہ میں نہایت عالی شان اور خوبصورت تھا۔ اور بڑا دار العلوم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے استحکام کی یہ حالت تھی کہ شورش ۵۷ء تک اپنی اصلی حالت پر قائم رہا۔ اگر اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش نہ آتا کہ اس شورش میں مکانات لوٹ لئے گئے۔ کڑی تختے تک لوگ اٹھالے گئے۔ تو آج بھی شاید وہ باقی رہتا۔ اس کی وسعت اور کشادگی کا یہ عالم تھا کہ اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں۔ مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور آج تک پکارا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد ان کے چاروں صاحبزادوں نے وہی مشغلہ درس وتدریس جاری رکھا۔ اور اس مدرسہ نے تعلیم دینیات میں وہ نام پیدا کیا کہ ہندوستان میں شہرہ ہو گیا۔ جب شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق مہاجر مکیؒ نے مدرسہ کی خدمت اپنے ذمہ لی۔ اس مدرسہ کی مسجد کا حال شاہ

عبدالعزیز صاحب اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

"دراں ہنگام بزرگاں بسیار و اولیا ر بسیار از یاراں والد معتکف مسجد بودند"۔ (ملفوظات شاہ عبدالعزیز صفحہ ۱۰۹) جب مولانا محمد اسحاق نے ۱۲۵۶ھ میں ہجرت کی تو مولینا مخصوص اللہ اور مولینا موسیٰ خلف مولانا رفیع الدین اس کی نگرانی فرمانے لگے۔ ان حضرات کے انتقال کے بعد مولوی موسیٰ صاحب کے ایک صاحبزادے میاں عبدالسلام بہت صغیر سن رہے۔ اور ایک صاحبزادی رہ گئیں۔ خاندان بھر میں کوئی ایسا نہ تھا جو عبدالسلام صاحب کو پڑھاتا لکھاتا۔ غرض یہ سلسلہ جو کئی پشت سے اس خاندان میں جاری تھا بند ہو گیا۔ اب چونکہ یہ کل جائداد رائے بہادر لالہ شیو پرشاد کی ہے۔ اس لئے اس گلی پر مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ لگا دیا گیا ہے۔ التقاط از کتاب "دارالحکومت دہلی" ص ۲۸۶/۲ و ص ۱۶۷/۲۔ از مولوی بشیر الدین صاحب

۵۔ مولینا محمد عاشق پھلتی

مولینا اپنی کتاب "التمہید" (حصہ اردو) میں فرماتے ہیں۔ عام طور پر صدہا اہل علم شاہ ولی اللہ صاحب سے مستفید ہوئے۔ حرمین شریفین سے با مذاق عالم اُن سے علم سیکھنے کے لئے دہلی آتے رہے۔ لیکن اُن کے کمل نظریے کو سمجھنے والے تین چار رفقاء سے زیادہ نہیں ہیں۔ (۱) اُن کے ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق (۲) جمال الدین شاہ محمد امین ولی اللہی کشمیری (۳) شاہ نور اللہ بڈھانوی (۴) شاہ ابو سعید بریلوی۔ پہلے تین حضرات شاہ عبدالعزیز کے استاد ہیں۔ اور چوتھے حضرت شاہ ابو سعید

خلیفہ ولی اللہ اور جد مادری حضرت سید احمد شہید ہیں۔ امیر شہید حضرت شاہ ابو سعید کے نواسے تھے۔ صفحہ ۲۳۔

امام ولی اللہؒ تفہیمات الہیہؒ (ص ۱۲۵ ب و ص ۱۲۶ ا) میں لکھتے ہیں۔ شیخ محمد عاشق شیخ عبید اللہ کے صاحبزادہ ہیں۔ اور شیخ عبید اللہ کے والد شیخ محمد قدس سرہٗ میرے نانا تھے بچپن ہی سے شیخ محمد عاشق کو مجھ سے محبت تھی۔ چنانچہ میرے والد شاہ عبدالرحیم مجھ سے شیخ محمد عاشق کو اللہ کی خوشنودی کی راہ میں اس طرح باہم دگر دوست پا کر خوش ہوتے اور فرماتے کہ آگے چل کر اس دوستی سے بڑا شاندار کام سرانجام ہوگا۔ شیخ عاشق کو مجھ سے طریقِ حق طلب کرنے کی خدا نے توفیق دی، اور اُن کا ظاہر و باطن دل و جسم اور زبان میری محبت کے رنگ میں رنگے گئے۔ اور وہ ہمہ تن مجھ سے اخذِ علم کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ موصوف اس راہ میں برابر آگے بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کی روح پورے طور پر بیدار ہو گئی۔ اور میں نے دیکھا کہ انھیں کامل درک اور مکمل احاطۂ علم ہو گیا ہے۔ چنانچہ مجھے اس طرف سے پورا الیقین ہے کہ نہ اُن کے حالات کبھی پلٹا کھائیں گے۔ اور نہ ان کے اقوال میں تذبذب پیدا ہوگا۔ میں نے دیکھا ہے کہ میرے اور ان کے درمیان جو دروازہ تھا وہ اس طرح کھل گیا ہے کہ جو کچھ وہ مجھ سے اخذ کرتے ہیں، اس میں مطلق تقلید کا رنگ نہیں ہوتا، یوں سمجھیے گویا کہ میں اور وہ دونوں ایک ہی سرچشمہ سے اخذ علم کرتے ہیں۔ شیخ عاشق کے اخلاق، ان کے اعمال، اور ان کے اطوار و اوضاع سب پسندیدہ اور مرغوب ہیں۔ وہ بحمد اللہ میرے خیر خواہ ہیں، میرے

علم کے رازداں ہیں، میرے اسرار کے محافظ ہیں، اور میری کتابوں کے نگراں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کتابوں کو صفحۂ قرطاس پر لانے کے وہ سبب اور باعث بنے، اور انہوں نے ان کتابوں کے مسودوں کو صاف بھی کیا، میرا خیال ہے کہ میرے علوم ان کی وجہ سے ہی لوگوں میں باقی رہیں گے۔ چنانچہ مجھے یہ الہام ہوا ہے کہ لوگوں میں ان کا ذکر خیر عام کر دوں، اور ان کی سربستہ صلاحیتوں کو پردۂ راز میں نہ رہنے دوں۔ میں نے ان کو اپنا خرقۂ تصوف پہنا دیا ہے جیسا کہ میرے والد بزرگوار نے مجھے اپنا خرقہ پہنا دیا تھا۔ اور جیسا کہ ان کے علاوہ ابو طاہر مدنی نے اپنے خرقہ سے مجھے سرفراز فرمایا تھا۔ اور حضرت ابو طاہر کا خرقہ تمام اولیاء کے خرقوں پر جامع تھا، اور میں نے شیخ محمد عاشق کو اجازت دی ہے کہ وہ دوسروں کو تصوف کے اُن اشغال کی تلقین کریں جو انہوں نے مجھ سے سُنے ہوں اور اس کے علاوہ ان اشغال کی بھی جو مجھ سے نہ سُنے ہوں۔ نیز وہ راہ سلوک کے طالبوں کو جو ان کے مرید ہوں جیسے اس کی مرضی ہو چلائے۔ اور ہر طبقے سے "فتوح" قبول کرے۔ نیز حدیث، تفسیر اور باقی دینی علوم جو اس نے مجھ سے پڑھے ہیں۔ یا جو ہم دونوں حرمین کے مشائخ سے ایک ساتھ پڑھتے رہے ہیں، دوسروں کو پڑھائے۔

"انفاس العارفین" میں موصوف کے متعلق امام ولی اللہ کا ارشاد ہے۔ فرماتے ہیں۔ والد بزرگوار نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ایک دفعہ اس فقیر اور شیخ محمد عاشق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ دونو باہم دگر

دوستی رکھتے ہیں اور انکی اس دوستی سے مجھے بڑی خوشی اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس ارشاد کی حقیقت مجھ پر بعد میں ظاہر ہوئی چنانچہ ہوا یہ کہ اس عزیز کو فقیر کے ساتھ ربط طریقت پیدا ہو گیا۔ اور موصوف میرے متبع بن گئے۔ مجھے امید ہے کہ یہ دوستی بے شمار فوائد کا باعث ثابت ہوگی۔

شاہ عبدالعزیز "عجالۂ نافعہ" میں لکھتے ہیں۔ والدِ ماجد کے بعد میں نے ان کے عالی مرتبت ساتھیوں مثلاً شاہ محمد عاشق اور خواجہ محمد امین ولی اللہی سے علم حاصل کیا۔ شیخ محمد عاشق نے والد ماجد کے ساتھ شیخ ابو طاہر اور حرمین کے دوسرے مشائخ سے اخذِ علم کیا تھا صفحہ ۱۰۲

شیخ محسن "الیانع الجنی" میں لکھتے ہیں۔ شیخ ولی اللہ کے جلیل القدر اصحاب میں سے ایک شیخ محمد عاشق ہیں۔ موصوف حجاز میں شاہ صاحب کے شریک سبق بھی رہ چکے ہیں، ان کی تصنیفات میں سے علم سلوک پر ایک مشہور کتاب ہے۔ اس کے بعد شیخ محمد امین کشمیری ہیں، جو اصل میں بخارا کے تھے اور دہلی میں بس گئے تھے۔ آپ اپنے استاد کی طرف منسوب ہوتے تھے، اور اسی نسبت سے مشہور عام و خاص تھے۔ اور ان دونوں بزرگوں سے شاہ عبدالعزیز نے پڑھا جیسا کہ وہ اپنی کتاب "عجالۂ نافعہ" میں بیان کرتے ہیں صفحہ ۹۴

رہے مولٰینا نور اللہ بڈھانوی۔ آپ امام ولی اللہ کے تلامذہ میں سے تھے تفہیمات جلد اوّل صفحہ اوّل پر شاہ صاحب نے ان کو جو اجازت نامہ لکھ کر دیا ہے مفصل موجود ہے۔ فقہ حنفی میں شاہ عبدالعزیز کے استاد تھے۔ اور آپ شاہ عبدالعزیز کے خسر بھی تھے۔ ان کے بیٹے مولٰینا ہبۃ اللہ ہیں

جن کے صاحبزادے مولینا عبدالحی ہیں۔ مولینا عبدالحی شاہ عبدالعزیز کے تلامذہ میں ان کے بھائیوں کے بعد سب سے بڑے آدمی ہیں۔ "انفاس العارفین" میں جو شاہ عبدالرحیم کے حالات پر مشتمل ہے، ان کے جستہ جستہ حالات موجود ہیں۔

۵۔ مدرسہ نجیب آباد

احمد شاہ ابدالی کو دعوت دینے میں نواب نجیب اللہ خاں اور نواب حافظ الملک رحمت خاں والئ بریلی وغیرہ امرا شریک تھے، حافظ الملک کی سرکار سے سینکڑوں طلبہ کو ماہوار امداد ملتی تھی۔ جو شاہ صاحب کے کالج میں تعلیم پاتے تھے، نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص مسترشدین سے تھے۔ شاہ صاحب ہی کے مشورے سے انہوں نے اور ان کے رفقاء نے احمد شاہ ابدالی کو قندھار سے بلایا۔ احمد شاہ کے بلانے میں وہ ایک واسطہ ثابت ہوئے۔ دراصل شاہ صاحب کی روحانیت کام کر رہی تھی۔ اس جنگ میں افواج ابدالی کے ساتھ نواب شجاع الدولہ وزیر اور نواب نجیب الدولہ کی افواج سرگرم کار رہیں اور بڑے اعلیٰ کارنامے دکھائے۔ ابدالی کی جنگ میں نواب نجیب الدولہ مقدمۃ الجیش کے افسر تھے۔ سیرالمتاخرین میں ہے "بعد از حصول ایں فتح (۱۱۷۴ھ) احمد شاہ ابدالی از میدان جنگ (پانی پت) خرامیدہ در سواد دہلی نزول فرمود و چندروز توقف نمودہ سلطنت برائے شاہ عالم و وزارت بنام شجاع الدولہ و امیر الامرائی بنام نجیب الدولہ مقرر نمود۔ و بہر دو سفارش ہم دگر نمودہ۔ نجیب الدولہ را مامور بودن شاہجہان

آباد کرد۔ ۱۶ شعبان ۱۱۷۴ھ ز باغ شالامار دہلی بقصدِ قندہار بکرانِ ہمت زیرِ آں کشید صفحہ ۹۱۵

نواب نجیب الدولہ نے ایک مدرسہ قائم کیا، تاکہ شاہ ولی اللہ کے طریقے کی تعلیم ہو۔ نواب مذکور کی عظمت وجلالت، اور علم دوستی کا اندازہ شاہ عبد العزیز کے ارشاد ذیل سے کیا جا سکتا ہے۔ "نزد نجیب الدولہ نہ صد عالم بود ادنیٰ پنج روپیہ و اعلیٰ پنج صد روپیہ می یافت" (ملفوظات شاہ عبد العزیز ۸۱)

نواب نجیب الدولہ ایسا عاقل اور ہوشیار تھا کہ کمتر ہوتے ہیں۔ امانت اور ایمانداری تو اس وقت اس پر ختم تھی۔ وہ اپنے پرانے آقاؤں نواب دوندے خاں رھیلہ۔ اور نواب وزیر شجاع الدولہ کی فرمانبرداری کئے جاتا تھا۔ اُس وقت بھی یہ جوانمرد اس ٹوٹی پھوٹی سلطنت کو نبھا رہا تھا۔ " تاریخ ہند از ذکاء اللہ ص ۳۱۶

۵۹ دائرہ شاہ علم اللہ

سید شاہ علم اللہ عہد عالم گیر کے مشہور عالم ربانی اور صاحب سلسلہ شیخ تھے۔ آپ شیخ آدم بنوری کے بڑے خلفاء میں سے تھے۔ اس طرح سے آپ اور حضرت مجدد کے درمیان صرف حضرت شیخ بنوری کا واسطہ تھا، سرتاپا اتباع سنت کا نمونہ تھے۔ شاہ غلام علی صاحب نقشبندی دہلوی کے در المعارف میں ہے۔ کہ آپ کے انتقال کی رات عالمگیر نے خواب میں دیکھا کہ آج رات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ بادشاہ کو اس خواب سے بہت تشویش ہوئی، علماء سے تعبیر دریافت کی۔

تو انہوں نے کہا. کہ یہ تاریخ لکھ لینی چاہیئے. اس رات کو سید علم اللہ صاحب کی وفات ہوئی ہوگی، کیونکہ وہی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ ہیں. سرکاری وقائع نگار کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ اسی شب کو سید صاحب نے انتقال فرمایا۔

سید احمد امیر شہید کی ولادت اسی دائرے میں جو اب تکیہ علم اللہ کے نام سے مشہور ہے. صفر ۱۲۰۱ھ میں اپنے والد سید محمد عرفان کے گھر ہوئی۔

۱۰ شیخ معین الدین ٹھٹوی

الشیخ معین الدین ٹھٹوی. عرف مخدوم ٹھارو (بالضمہ مجہولہ) مخدوم محمد ہاشم اور ان کے صاحبزادے عبداللہ کے استاد ہیں۔ شیخ عبدالحق دہلوی کے طریقہ کیخلاف شاہ ولی اللہ کے طریقے کو ترجیح دینے کے لئے آپ نے "دراسات اللبیب" لکھی۔ اس کتاب کا "الدراستہ الثانیہ عشر" خصوصی طور پر مطالعہ کرنا چاہیئے. جس میں انہوں نے امام بخاری کی تاریخ صغیر کی اس عبارت کا رد لکھا ہے. جہاں انہوں نے امام ابو حنیفہ پر جرح کی ہے. کتاب مذکور لاہور میں طبع ہو چکی ہے. اہلحدیث ہی نے طبع کرائی. اس کا رد شیخ عبداللہ مذکور نے لکھا جس میں شیخ عبدالحق کے طریقے کی ترجیح ہے. کتاب کا نام "ذب الذبابات عن الدراسات" ہے۔ دارالرشاد سندھ میں اس کا ایک نسخہ خطیہ موجود ہے۔ پورا تذکرہ شاہ معین الدین کا تحفہ الکرام و تاریخ سندھ میں موجود ہے. کتاب مطبوعہ ہے۔ کراچی مدرسہ مظہر العلوم میں کتاب موجود ہے۔

(من شعرہ)

سگت راخون دل دادم کہ با من آشنا گردد　　ندانستم زبخت بد کہ او دیوانہ خواہد شد

لاا شاہ عبد اللطیف بھٹائی

شاہ عبد اللطیف بھٹائی کی کتاب" الرسالہ" مطبوعہ سندھی زبان میں وہی درجہ رکھتا ہے۔ جو فارسی میں مثنوی مولانا روم کا ہے۔ اس کو ہندو اور مسلمان سب مساوی طور پر پڑھتے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے۔

شاہ محمد معین مصنف" دراسات اللبیب" اور شاہ عبد اللطیف ہم مسلک بزرگ ہیں اور وحدۃ الوجود کے دونوں یکساں عارف ہیں۔ شاہ محمد معین جب فوت ہونے لگے۔ تو آپ نے وصیت فرمائی کہ میرا جنازہ تیار کر کے مسجد میں رکھ دینا جب تک کہ شاہ عبد اللطیف نہ آئیں، اُن کا انتظار ضروری ہے۔ شاہ عبد اللطیف صحرا نورد تھے۔ کیا معلوم کہ وہ کس صحرا میں ہوں گے۔ اور ان کو کس طرح اطلاع ملے گی۔ اور کب آئیں گے؟ مگر جنازہ تیار ہونے کے تھوڑی دیر بعد آپ تشریف لے آئے۔ اور امامت کرائی۔ بعدہٗ کہا کہ آج کے بعد ٹھٹہ سے ہمارا تعلق منقطع ہو گیا ہے۔

فائدہ لا کپتان الیگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔ کہ شہر ٹھٹہ (سندھ) میں مختلف علوم و فنون کے چار سو کالج تھے۔ علامہ مقریزی جو ہندوستان کی سیاحت کے لئے تشریف لائے۔ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ محمد شاہ تغلق کے عہد میں صرف دلی شہر میں ایک ہزار مدارس تھے۔ پروفیسر ماکس ملز سرکاری کاغذات کی بنا پر لکھتا ہے۔ کہ برطانوی حکومت سے قبل بنگال میں ۸۰ ہزار دیسی مدارس تھے۔ اس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنی ہوئے کہ آبادی کے

ہر چالیس افراد کے لئے ایک مدرسہ قائم تھا۔ ریورنٹ وارڈ نے ۱۸۲۱ء میں بیان کیا تھا کہ انڈیا ڈسٹرکٹ سکولوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہاں ہر اکتیس ۳۱ لڑکے پر ایک سکول ہے۔ (التقاط از ش۔م)

۱۱ معرکہ پانی پت

امام ولی اللہ نے ۱۱۴۴ھ میں جو خواب دیکھا تھا، اس کے دو حصے تھے۔ حصہ اوّل کی تفصیل حسب ذیل ہے

شاہ صاحب فرماتے ہیں "میں نے دیکھا کہ بادشاہِ کفار مسلمانوں کے شہروں پر قابض ہوگیا ہے۔" اس خواب کا مشاہدہ یوں کرایا گیا کہ لال قلعہ پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا۔ سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ ذی الحجہ کی انیسویں تاریخ کو لال قلعہ پر بدمست بھاؤ کا قبضہ ہوگیا۔ اور حرم سرائے شاہی اور سلطنت کے سارے کارخانے بھی مرھٹوں کے تسلط میں آ گئے ذلک تقدیر العزیز العلیم"۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "میں نے دیکھا کہ بادشاہ کفار مسلمانوں کے مال و دولت کو لوٹ رہا ہے۔" اس حصہ خواب کی تعبیر یہ ہے کہ جسوقت لال قلعہ پر مرہٹوں نے قبضہ کیا۔ تو انہوں نے بڑی لوٹ کھسوٹ کی، اس کا اندازہ سیر المتاخرین کی اس عبارت سے کیجئے۔ "بھاؤ کی دنائت اور تنگ چشمی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ اس نے دیوانِ خاص کی چھت کو جس پر کہ چاندی کی میناکاری تھی اکھڑ دا کر پگلا لیا۔ اور قدم بنوی مقبرہ نظام الدین اولیاء اور مرقد محمد شاہ پر جو سونے اور چاندی کے جھاڑ اور ظروف اور

شمع دان اور قندیلیں رکھی ہوئی تھیں، ان کو لوٹا۔ اور سب کو پگلا کر سونے اور چاندی میں بدل لیا"۔ بھاؤ کی مذکورہ ذیل دنائت بھی قابلِ توجہ ہے۔ میر غلام علی "خزانۂ عامرہ" کے صفحہ ۴۸ میں لکھتے ہیں: "بالاجی راؤ باوجود اس کے کہ وہ ہندوستان اور دکن کی سلطنت کا مالک بن چکا تھا، باجرہ کی روٹی کھاتا تھا۔ اور اسے گندم کی روٹی اچھی نہ لگتی تھی، وہ کچے بیگن، کچے آم اور کچے کرسنہ بڑے شوق سے کھاتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ برہمنوں کا اصل پیشہ چونکہ گداگری ہے اور ہندوؤں کے ہاں یہ دستور ہو چکا ہے کہ وہ برہمنوں کو صدقے دیتے ہیں، اس لئے اس قوم کی نسل ہا نسل سے دریوزہ گری عادت سی ہو گئی ہے۔ چنانچہ طماعی اور غرض کا بندہ ہونا برہمنیت کا خاصہ بن چکا ہے۔ اور یہی سبب تھا کہ بالاجی راؤ سلطنت و امارت کی مسند پر بیٹھنے کے باوجود کیش گدائی کے چکر سے نہ نکل سکا تھا۔ اس زمانہ میں یہ حالت تھی کہ اگر کوئی غرض مند اپنی ضرورت کے لئے برہمن حکام یا متصدیوں کے پاس جاتا تو ان میں سے ہر ایک کی نظر اس بات پر ہوتی کہ وہ ان کے لئے کیا لایا ہے ؎

بدست خلق عالم کاسۂ دریوزہ می بینم   گدا چوں پادشاہ گردد گدا سازد جہانے را

ان میں سے خواہ کوئی غنی ہوتا یا فقیر ارہر کی دال پر اس کی غذا کا دار و مدار تھا۔ اور وہ دال کو بگھارتے تک بھی نہ تھے۔ اور نہ وہ اس میں اوپر سے گھی ڈالتے۔ تاکہ اس طرح ہی دال کی خشکی دُور ہو جاتی۔ وہ سُرخ مرچ ہینگ اور ہلدی ہر کھانے میں ڈالتے، اور بڑی کثرت سے ان چیزوں کا

استعمال کرتے۔ کھانا پکاتے وقت مرچ ڈالی جاتی۔ اور اس کے علاوہ جب سالن کے ساتھ روٹی کھاتے تو کچی مرچ بھی ساتھ کھاتے جاتے۔"

شاہ صاحب اپنا خواب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "بادشاہ کفار نے خاص اجمیر کے شہر میں کفر کے شعائر جاری کر دیئے۔ اور اس نے شعائر اسلام کو باطل قرار دیا۔" یعنی دہلی جس کا روحانی مرکز اجمیر ہے (خواجہ معین الدین چشتیؒ نے وہیں سے اشاعت و تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا تھا جس کے نتیجہ میں دہلی فتح ہوئی) اسی دہلی میں ملک الکفار کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے یہاں شعائر کفر کا اعلان کر دیا۔ اور شعائر اسلام کو ختم کر دیا۔ سیر المتاخرین کا مصنف لکھتا ہے کہ بھاؤ نے شاہجہاں آباد کی قلعہ داری نارو شنکر برہمن کے سپرد کی۔ اور ایک جماعت کو قلعہ کی حراست کے لئے اس کے ہمراہ بھیجا۔

الغرض امام ولی اللہ نے جیسے جیسے خواب میں دیکھا تھا، انھیں خصوصیات کے ساتھ ملک الکفار مسلمانانِ ہند پر غالب آیا۔ اور ان کے مرکز سیاسی پر اس نے قبضہ کر لیا۔

اسی خواب کا دوسرا حصہ معرکۂ پانی پت سے متعلق ہے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ احمد شاہ ابدالی نے یکایک ہندوستان پر حملہ کر کے مرہٹہ تحریک کو پانی پت کے میدان میں ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ" افواج دکن معہ بھاؤ و سواس راؤ اور دوسرے سرداروں سمیت اس معرکہ میں کام آئیں۔ اور مرہٹوں کی سلطنت اس طرح بیخ و بنیاد

سے اکھڑی کہ ہندوستان (مراد شمالی ہند سے ہے) میں ان کی جماعت کا اثر تک نہ رہا۔ اور اس کے بعد تمام قلمرو ہندوستان میں مرہٹوں کا ایک نفر بھی دیکھنے میں نہ آتا تھا۔" دراصل اس کا سبب خواب مذکورہ بالا کا یہ ٹکڑہ ہے جس میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔" میں نے خواب میں اپنے آپ کو یوں دیکھا جیسا کہ میں " قائم الزماں" ہوں۔ یعنی اللہ تعالےٰ کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو اس کو سر انجام دینے کے لئے وہ مجھے "جارحہ" یعنی ذریعہ بناتا ہے"۔ شاہ صاحب کے "جارحہ" ہونے کی یہ صورت ہوئی کہ سب سے پہلے بھاؤ نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے نواب شجاع الدولہ والئے اودھ سے سازباز شروع کی۔ اسی سلسلہ میں اس نے اپنا ایک برہمن سفیر اس کے پاس بھیجا۔ اس کے جواب میں شجاع الدولہ نے کہا۔" ایک مدت سے دکن کے برہمن ہندوستان پر مسلط ہو گئے ہیں۔ ان سے خدا کی خلق کو نہ آسائش پہنچی۔ اور نہ وہ لوگوں کی آبرو کے روادار ہیں۔ ان کی ساری جدوجہد محض اپنی اغراض کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ ان کے ہاتھوں خلقت تنگ آ چکی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے پاسِ ناموس کی خاطر اور اپنی آبرو بچانے کے لئے احمد شاہ ابدالی کو بڑی منت وسماجت کے بعد ولایت سے بلوا بھیجا ہے، اور انہوں نے شاہ ابدالی کے حملے کے صدموں کو مرہٹوں کی ایذا سے آسان اور کم تکلیف دہ سمجھا ہے۔" اس کے بعد سیر المتاخرین کا مصنف نواب نجیب الدولہ وغیرہ امرائے ہند کے متعلق لکھتا ہے۔

نواب نجیب الدولہ اور دوسرے امراء مرہٹوں کی وجہ سے پریشان تھے۔ اور

عماد الملک تو مرہٹوں کے ہاتھوں خود اپنی آنکھوں سے سلطنت کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ ان سب نے احمد شاہ ابدالی کو عریضے لکھے۔ اور اُسے ہندوستان آنے کا بلاوا بھیجا۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ کے خواب میں مذکور ہے "دونوں فریق آپس میں لڑنے لگے ...... ایک شخص کھڑا ہوا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ اُن مسلمانوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو آپس میں لڑ رہے ہیں۔ میں نے یہ سُنا اور اس کا جواب نہ دیا۔" معرکۂ پانی پت کے سلسلہ میں تاریخ ہند اس امر پر شاہد ہے کہ مرہٹوں کی اس جنگ میں مسلمان کی ایک جماعت ان کی فوج میں بھرتی ہو کر میدان جنگ میں لڑی۔ عرب اور ہندوستانی فوج کے علاوہ توپ خانہ کا سردار ابراہیم گاردی تھا۔ اس نے عین معرکۂ جنگ میں ہمت کر کے توپوں کی زنجیر بندی کی۔ اور مرہٹوں کو کچھ دیر تک بچائے رکھا۔ سیر المتاخرین میں ہے "۶ جمادی الاخری ۱۱۷۴ھ بروز چہار شنبہ بھاؤ نے پانی پت کے میدان میں اپنی فوجوں کی صفیں جمائیں۔ اور ابراہیم خاں کو فرنگی توپ خانہ دے کر آگے کیا۔ ایک طرف مرہٹے "ہر ہر" کے نعرے لگاتے ابدالی لشکر کی طرف بڑھے اور دوسری طرف ابراہیم نے بڑے زور شور سے توپوں سے گولہ باری کی۔ بھاؤ نے اپنے خاص رسالہ کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ انہوں نے گھوڑوں کی باگیں اٹھائیں اور ابدالی کے لشکر پر جھپٹ پڑے۔"

اس کے بعد میں خواب کا اگلا حصّہ یہ ہے "میں نے دیکھا کہ لوگوں نے ملک الکفار پر دھاوا کر کے اس کو ذبح کر دیا ہے۔ جب میں نے خون اُس کی

رگوں سے بہتے دیکھا تو میں نے کہا۔۔۔ الخ" اس کی تعبیر اس طرح ہوئی:۔ تاریخ ہند مصنفہ سید ہاشمی میں مذکور ہے کہ بھاؤ نے دلی پر قبضہ کرنے کے بعد ارادہ کیا کہ اپنے بھتیجے بسواس راؤ پسر بالاجی راؤ کو تخت دہلی پر بٹھا کر یہ اعلان کردے کہ اب سے ہندوستان کے تخت ونگین کے مالک مرہٹہ برہمن ہیں۔ مگر جنگ پانی پت کے خاتمہ تک اس نے اس اعلان کو ملتوی کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن اسی جنگ میں بسواس راؤ امیدوار تخت وتاج اور تخت بخش بھاؤ ہر دو کام آئے۔ سیر المتاخرین کا مصنف اس واقعہ کے متعلق لکھتا ہے: "بڑے بڑے سرداروں میں سے شاہزادہ بسواس راؤ پسر بالاجی راؤ جس کا ابھی عین شباب تھا گولے کا نشانہ بنا۔ اس کے بعد مرہٹوں کا سپہ سالار بھاؤ جو بالاجی راؤ کا چچا زاد بھائی تھا ہلاک ہوا غنیم کے بڑے بڑے سرداروں میں سے سوائے دو تین سو نفر کے کوئی بچ کر نہ جاسکا۔ اس شکست فاش کے صدمے سے بالاجی راؤ بھی دل شکستہ ہوگیا۔ اور دوسری دنیا کو سدھارا۔ وہ اپنے بیٹے اور بھائی کے بعد کل پانچ ماہ سترہ روز جیا۔ ابراہیم خاں گاردی میدان جنگ میں اسیر ہوا۔ اور اس کا سر تلوار سے اڑا دیا گیا۔" یہ ہے تعبیر خواب کے اس جملہ کی کہ "اللہ تعالےٰ نے مجھے اپنے کاموں کے لئے "جارحہ" بنایا۔ اور یہی معنی اس ارشاد کے ہیں کہ "میرے دل میں اس کی ذات اقدس کی طرف سے نہ کہ اس عالم کی جہت سے یہ باتیں ملہم کی گئی ہیں۔"

بعد ازاں شاہ صاحب نے خواب میں دیکھا تھا کہ "ہم اجمیر تک

پہنچے "۔ بعینہ اسی طرح ابدالی معہ افواج قاہرہ کے شہروں کو فتح کرتا ہوا دہلی پہنچا۔ اسی "جارحہ" کا تقاضا تھا کہ شاہ ابدالی فتح کے بعد حکومت دہلی حق داروں کے حوالے کر کے خود سیدھا قندھار روانہ ہو گیا۔ اور یہاں حکومت کرنے کا خیال تک اس کو نہ آیا۔

۱۳ خروج مہدی کا عقیدہ

امام ولی اللہ "ازالۃ الخفا" میں لکھتے ہیں "۔ اب سوال ابن ماجہ کی مشہور حدیث کا ہے، اس حدیث کا اشارہ ابو مسلم کے خراسان سے نکلنے کی طرف ہے۔ اور اسی خلیفہ کو مہدی کہا گیا ہے، اور اسی کی نصرت کی ترغیب دی گئی ہے۔ ابن ماجہ کی حدیث یہ ہے، عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ بنی ہاشم کے چند نوجوان لڑکے آپ کی طرف آئے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دیکھا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور چہرے کا رنگ بدل گیا، عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ کے چہرے پر برہمی کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز آپ کو ناپسند ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہم اہل بیت کے لئے اللہ نے دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو چن لیا ہے۔ اور میرے بعد میرے اہل بیت کو بڑی سخت تکلیفوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ وہ وطن سے بے وطن ہوں گے، اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں مارے مارے پھریں گے۔ میرے اہل بیت کی یہ حالت اس وقت تک رہے گی جب تک کہ مشرق کی طرف سے ایسے لوگ نہ آئیں گے جن کے پاس سیاہ

جھنڈیاں ہوں گی، وہ خیر و بھلائی کا مطالبہ کریں گے لیکن وہ انھیں نہیں دی جائے گی، چنانچہ وہ لڑیں گے اور کامیاب ہوں گے، اور جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ ان کو مل جائے گا۔ یہ لوگ اس چیز کو قبول کر کے ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیں گے جو میرے اہل بیت میں سے ہوگا۔ اور یہ دنیا کو اس طرح عدل و انصاف سے بھر دے گا جیسے اس سے پہلے اُن لوگوں نے ظلم و جور سے بھر دیا تھا۔ تم میں جس کو یہ زمانہ ملے، اسکے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے پاس پہنچے خواہ اُسے برف پر گھسٹ کر ہی آنا پڑے۔

ابن ماجہ نے ثوبان سے ایک روایت کی ہے، جس میں مذکور ہے کہ تین شخص جو سب کے سب خلیفہ کے بیٹے ہوں گے لڑیں گے۔ اور جب ان میں سے ایک کے حصہ میں وہ "کنز" آجائے گا تو مشرق سے سیاہ جھنڈیوں والے نکلیں گے۔ اور وہ تم سب کو قتل کریں گے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا، وہ مجھے یاد نہیں رہا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اگر تم اس کو دیکھو تو اس کی بیعت کر لینا۔ اور اس کے پاس برف پر گھسٹتے ہوئے پہنچنا، کیونکہ خلیفۃ اللہ مہدی وہی ہے۔ اسی مضمون کی ابن ماجہ نے ایک اور حدیث روائت کی ہے۔ عبد اللہ بن حارث بن جزر الزبیدی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مشرق کی طرف سے لوگ نکلیں گے جو مہدی کے لئے زمین تیار کریں گے۔

امام ولی اللہ ابن ماجہ کی ان تین حدیثوں پر بحث کرتے ہوئے

"ازالۃ الخفا" میں لکھتے ہیں: "فقیر کے نزدیک ان تین حدیثوں کی تحقیق یہ ہے کہ مہدی سے مراد بنو عباس کا خلیفہ مہدی ہے۔ اس مہدی سے وہ مہدی مقصود نہیں۔ جو آخری زمانے میں ظاہر ہو گا۔ حدیث میں مہدی کا ذکر کیا گیا ہے اور اُسے خلیفہ اللہ کہا ہے، اور اس کی مدد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنو عباس کو تقدیر کی طرف سے خلافت دیئے جانے کا فیصلہ ہو چکا تھا، اور اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی گنجائش نہ تھی۔ دراصل یہ بتانا مطلوب تھا کہ اور لوگوں کی طرح جنہوں نے خلافت حاصل کرنے کی کوششیں کیں اور ناکام رہے اور سوائے شور اور گڑبڑ کے اُن کے ہاتھ کچھ نہ آیا، بنو عباس ناکام نہ رہیں گے۔ چنانچہ بنو عباس کا مہدی اس لئے خلیفۃ اللہ ہے کہ تقدیر الٰہی میں عباسیوں کے لئے خلافت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور یہ فیصلہ کسی طرح رد نہیں کیا جا سکتا۔ بات یہ ہے کہ شریعت میں سب سے اہم چیز تو یہ ہے کہ نزاع نہ رہے اور ملک میں گڑبڑ کا خاتمہ ہو جائے اور خلافت کا کام استحکام پا جائے۔ اس لئے مستحکم خلافت خواہ اس کی مسند پر بیٹھنے والا زوال پذیر خلافت کے صاحب اختیار سے کمتر ہو۔ انتشار اور گڑبڑ سے ہر حال میں بہتر ہے۔"

میرے نزدیک (از مولینا) اگر اس مہدی کا آنا جو آخری زمانہ میں ظاہر ہو گا احادیث سے صحیح ثابت ہو بھی جائے۔ تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ وہ مہدی اس وقت آئے گا جب قیامت کی گھڑی قریب آ جائے گی۔ اس وقت تو نہ شریعت کے عمل دخل کا امکان رہے گا اور

نہ قانون کے نافذ ہونے کی فرصت۔ اس لئے مہدی کے آنے پر مسلمانوں کی فلاح کو معلق رکھنا کسی طرح ٹھیک نہیں ہے۔ بے شک وہ حدیثیں جو مہدی کے آنے کے متعلق امام ولی اللہ نے بیان کی ہیں وہ علم حدیث کی تیسرے درجہ کی کتابوں میں مروی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان روایتوں کو قبول کرتے ہیں، کیونکہ ان کی اصل ہمارے نزدیک ثابت ہے۔ امام ابو داؤد ہلال بن عمرو سے روائت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ میں نے علیؓ کو یہ کہتے سُنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماوراء النہر سے ایک آدمی ظاہر ہوگا جسے حارث کہا جائے گا۔ اس کے پیش پیش ایک اور آدمی ہوگا جس کا نام منصور ہوگا۔ یہ میرے اس قول کو عملی جامہ پہنانے کے لئے زمین ہموار کرے گا، جس طرح قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذِ عمل کا ذریعہ بنے تھے۔ اس وقت ہر مومن کا فرض ہوگا کہ اس کی مدد کرے۔ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ نے شاید یہ کہا ہو کہ اُس وقت ہر مومن کا فرض ہوگا کہ اس کی پکار پر لبیک کہے۔

میرے نزدیک (از مولینا) یہ ساری کی ساری حدیثیں عباسیوں کے مہدی کی طرف بالصراحت اشارہ کرتی ہیں۔ جیسا کہ امام ولی اللہ نے بیان فرمایا ہے۔ اور نیز ان حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت کو یہاں سارے کے سارے بنو ہاشم مراد ہیں۔ اور حدیث کے یہ الفاظ کہ یہ مہدی زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سنت پر عمل کرے گا۔ اور عدل و انصاف کے متعلق اسلام نے جو

قاعدے اور ضابطے ہیں، خود ان کا پابند رہے گا۔ جیسا کہ بنو امیہ میں عمر بن عبدالعزیز تھے۔ السیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ سفیان ثوری فرمایا کرتے تھے کہ عباسیوں کا مہدی عمر بن عبدالعزیز کا مثیل ہے۔ دوسرے لفظوں میں مہدی ان ظالم فرمانرواؤں کی طرح نہ ہوگا جو اپنے آپ کو قوانین اور ضابطوں سے مستثنیٰ قرار دے لیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی عباسی مہدی اُن حدیثوں کا مصداق ہے جن میں اہل بیت میں سے ایک آدمی کے ظاہر ہونے کا اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک حدیث اور ہے جس کو ابوداؤد نے عاصم سے اور عاصم نے زر سے اور انہوں نے عبداللہ بن مسعود سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر دنیا کی عمر ایک دن کی بھی رہ گئی تو اللہ تعالےٰ اس ایک دن کو بھی اتنا لمبا کر دے گا کہ ایک آدمی میرا یا میرے اہل بیت میں کا ظاہر ہو۔ اس کا نام میرے نام کا سا ہوگا، اور اس کے باپ کا نام بھی میرے باپ کے نام کا سا ہوگا۔ اور وہ ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ مہدی عباسی کا نام محمد بن عبداللہ تھا۔ اور نیز وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت یعنی بنو ہاشم میں سے تھا۔ چنانچہ امام ولی اللہ کا اشارہ اسی مہدی کی طرف ہے۔ اور یہی وہ مہدی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ آخری زمانے میں ظاہر ہوگا۔

عام طور پر مشہور یہ ہے کہ مہدی حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ہوگا۔ چنانچہ بعد کے زمانہ میں اصحابِ کشف نے اس بات پر بہت

زور دیا۔ اور جب بغداد تباہ ہوگیا اور عباسی خلافت کا نام و نشان مٹ گیا تو مہدی کے اولاد فاطمہؓ میں سے ہونے پر اور اصرار ہونے لگا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ جن حدیثوں میں مہدی کے فاطمی النسب ہونے کا ذکر آیا ہے۔ وہ اسناد کے اعتبار سے ضعیف قرار دی گئی ہیں۔ میرے خیال میں امام ابوداؤد کا یہ رجحان تھا کہ بارہ اماموں میں سے ایک کو مہدی قرار دیں۔ اسی غرض سے موصوف نے مہدی کے باب میں یہ حدیث روایت کی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایسی روائتیں بھی بیان کی ہیں۔ جن سے عبداللہ بن زبیر کی خلافت اور لشکر کے دھنس جانے کے قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ نیز امام مالک عبداللہ بن زبیر کو ائمہ میں سے شمار کرتے تھے، اور ان کے مقابلہ میں عبدالملک بن مروان کی خلافت کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اس باب میں سب سے پہلے وہ حدیث بیان کرتے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مہدی اہل بیت میں سے ہوگا۔ یہاں وہ اہل بیت کی صراحت نہیں کرتے۔ اس کے بعد جو حدیثیں درج کرتے ہیں، ان میں مذکور ہے کہ یہ مہدی اولادِ فاطمہ اور اولادِ حسن میں سے ہوگا۔ لیکن اس باب کے آخر میں جو حدیثیں مروی ہیں، ان کا مصداق وہ مہدی ہے۔ جو منصورؔ کا بیٹا تھا اور وہ عباسی کا تیسرا خلیفہ ہے۔ غرضیکہ احادیث کو اس ترتیب سے ذکر کرنے سے اُن کا مقصد دراصل یہ ہے کہ قارئین یہ جان لیں کہ مرجح قول آخری کا ہے۔

شیخ ابوالطیب شمس الحق اپنی کتاب "عون المعبود" میں لکھتے ہیں: "شیعہ اور ان میں بھی خاص طور پر امامیہ فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے بعد امام حق حضرت علی ہیں۔ اور ان کے بعد حسن پھر حسین، پھر زین العابدین پھر محمد باقر پھر جعفر صادق پھر موسیٰ کاظم پھر علی رضا پھر محمد متقی پھر علی نقی پھر حسن عسکری ہیں۔ حسن عسکری کے بیٹے مہدی ہیں جن کا انتظار کیا جا رہا ہے شیعہ کہتے ہیں کہ مہدی منتظر اپنے دشمنوں کے خوف سے روپوش ہو گئے ہیں۔ ایک دن آئے گا کہ یہ ظاہر ہوں گے۔ اور ظلم وجور سے بھری ہوئی زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ ان لوگوں کے نزدیک عمر کا اتنا لمبا ہونا اور زندگی کا اس قدر امتداد کوئی انہونی بات نہیں۔

میرے (مولینا) خیال میں اہل سنت اور شیعہ کے درمیان اصل نزاع حسب ذیل ہے۔ قرآن مجید نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اور اس نے بشارت دی کہ قرآن کا دین سب دینوں پر غالب ہو کر رہے گا۔ اب ہوا یہ کہ اکثر ممالک خلافتِ راشدہ کے عہد میں مفتوح ہوئے۔ اور ان کے بعد بنو امیہ، بنو عباس اور ہندوستان کے بادشاہوں نے اسلامی سلطنت کی سرحدوں کو وسیع کیا۔ لیکن شیعہ تو ان میں سے کسی کی سلطنت کو جائز نہیں سمجھتے۔ اس لئے ان کے نزدیک قرآن کا یہ وعدہ کہ اس کا دین سب دینوں پر غالب ہو کر رہے گا ہنوز پورا نہیں ہوا۔ اور ان کے عقیدہ میں یہ وعدہ صرف اولاد فاطمہ میں سے ہی کسی امام کے ہاتھ سے عملی جامہ پہن سکتا ہے۔ الغرض یہ اساس ہے جس پر ان کے ہاں مہدی کے آنے کے عقیدہ کی عمارت بنی۔

باقی رہا اہل سنت کا معاملہ، سو ان کے نزدیک تو قرآن کا یہ وعدہ

مہاجرین اور انصار کے ہاتھوں پورا ہو چکا، اور وہ حضرت علی اور ان کی اولاد کو بھی ان مہاجرین اور انصار کی جماعت میں شامل سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بات یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی حدیثوں میں فرمایا ہے کہ میری امت میں جھوٹے دجال ہوں گے۔ اور یہ بھی خبر دی ہے کہ ایسے ائمہ بھی پیدا ہوں گے جو اصحابِ رشد ہوں گے اور مہدی ہوں گے اور کذابوں اور باطل پرستوں نے دین میں جو فساد برپا کر رکھا ہوگا۔ وہ اس کی اصلاح کریں گے۔ اور نیز یہ بھی بتایا ہے کہ یہ ائمہ جیسے کہ قریش کے اور قبیلوں سے ہوں گے ویسے بنو ہاشم میں سے ہوں گے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ نفاق میں غلو رکھنے والے امامت اور مہدیت کو نبوت کا درجہ دیتے ہیں۔ اور اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور انبیاء کا آنا مانتے ہیں۔ سو تم عقل سے کام لو، اور بے سوچے سمجھے ورق گردانی میں نہ پڑو۔

امام ولی اللہ "فیوض الحرمین" میں لکھتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شیعوں کے بارے میں ایک روحانی سوال پوچھا، تو مجھے یہ القا کیا گیا کہ "ان کا مذہب جھوٹا ہے۔ اور ان کے مذہب کے جھوٹے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ "امام" کو مانتے ہیں"۔ بعد ازاں جب میں اس (کیفیت جذب) سے نکلا تو میں سمجھا کہ انکے ہاں چونکہ امام معصوم ہوتا ہے اور ان کے نزدیک اس امام کی اطاعت فرض ہے۔ اور وہ مانتے ہیں کہ اسے باطن میں وحی بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ نکلا کہ "امام" ماننے سے ختم نبوت کا انکار لازم آتا ہے۔

۷۔ چار بنیادی اخلاق

امام ولی اللہ "ہمعات" میں لکھتے ہیں۔ اس فقیر پر یہ بات روشن کی گئی ہے کہ تہذیب نفس کے سلسلہ میں جو چیز شریعت میں مطلوب ہے وہ چار خصلتیں ہیں۔ حق تعالےٰ نے انبیاء علیہم السلام کو انہی چار خصلتوں کو قائم کرنے کے لئے بھیجا۔ تمام ملل حقہ میں انہی چار خصلتوں کا ارشاد اور ان کے حاصل کرنے کی ترغیب و تحریص ہے۔ "بر" یعنی نیکی ان چار خصلتوں کا حاصل ہے۔ اور گناہ سے مراد وہ عقائد و اعمال و اخلاق ہیں جو انہیں چار خصلتوں کی ضد ہیں۔

ان چار خصلتوں میں سے ایک طہارت ہے۔ اس کی حقیقت کی طرف میلان ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ لیکن یہ گمان نہ کر لینا کہ یہاں طہارت سے مراد وضو اور غسل ہے۔ طہارت کا اصل مقصود وضو اور غسل کی روح اور ان کا نور ہے۔ جب آدمی نجاستوں میں آلودہ ہو۔ اور میل چرک اور بال اس کے بدن پر جمع ہوں۔ اور بول و براز اور ریح نے اس کے معدہ میں گرانی پیدا کی ہو تو ضروری اور لازمی بات ہے کہ وہ انقباض، تنگی اور حزن اپنے اندر پائے گا۔ اور جب وہ غسل کرے گا۔ اور زائد بالوں کو دور کرے گا۔ اور نیا لباس زیب تن کرے گا۔ اور خوشبو لگائے گا تو اسے اپنے نفس میں انشراح، سرور اور انبساط کا احساس ہوگا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ طہارت یہی وجدانی کیفیت ہے، جو انس اور نور سے تعبیر کی جاتی ہے۔

دوسری خصلت خدا تعالےٰ کے لئے خضوع یعنی نہایت درجہ کی عجز و نیازمندی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک سلیم الفطرت

شخص جب طبعی اور خارجی تشویشوں سے فراغت کے بعد صفات الٰہی، اس کے جلال اور اس کی کبریائی میں غور کرتا ہے تو اس پر حیرت اور دہشت کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ یہی حیرت اور دہشت خشوع، خضوع، اخبات یعنی نیازمندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک سوچنے والا معقول انسان جب کائنات کی اس گتھی کو حل کرنے سے عاجز آجاتا ہے اور اس عجز اور افتادگی کی حالت میں کسی اور قوت کے سامنے آپ کو بے دست و پا پاتا ہے، تو اس کی یہ بے دست و پائی اُسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے سے بلند تر کسی اور قوت کو مانے۔ جب نفس اس کیفیت سے رنگین ہوجاتا ہے اور یہ خصلت اس کے اصل جوہر میں داخل ہوجاتی ہے۔ تو اس شخص اور ملاء اعلیٰ کے مابین ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور اس سے اس شخص پر وہ معارف جلیلہ مترشح ہوتے ہیں جن کا قالب تجلیات الٰہیہ ہیں۔

تیسری خصلت سماحت اور فیاضی ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ نفس طلب لذت، حب انتقام، بخل اور حرص وغیرہ سے مغلوب نہ ہو۔ اس ذیل میں عفت، جد و جہد، صبر و عفو، سخاوت، قناعت اور تقویٰ آ جاتے ہیں۔ شکم اور فرج کی خواہش کے قبول نہ کرنے کا نام عفت ہے۔ آسائش اور ترک عمل کی خواہش کو قبول نہ کرنے کا نام جد و جہد ہے۔ اور جزع و فزع کو روکنا صبر ہے، اور انتقام کی خواہش کو دبانا عفو اور خواہش بخل کو چھوڑ دینے کا نام سخاوت اور حرص کو قبول نہ کرنا قناعت ہے،

شریعت کی بنائی ہوئی حدوں سے تجاوز نہ کرنا تقویٰ ہے۔

چوتھی خصلت عدالت ہے، سیاسی اور اجتماعی نظاموں کی روح رواں یہی خصلت ہے۔ ادب۔ کفایت، حریت۔ سیاست مدینہ اور حسن معاشرت وغیرہ سب عدالت کی شاخیں ہیں۔ اپنی حرکات وسکنات پر نگاہ رکھنا اور عمدہ اور بہتر وضع اختیار کرنا اور دل کو ہمیشہ اس طرف متوجہ رکھنا ادب ہے۔ جمع وخرچ، خرید وفروخت اور تمام معاملات میں عقل و تدبّر سے کام لینا کفایت ہے، خانہ داری کے کاموں کو بخوبی سرانجام دینا حریت ہے۔ اور شہروں اور لشکروں کا اچھا انتظام کرنا سیاست مدینہ ہے۔ بھائیوں میں نیک زندگی بسر کرنا، ہر ایک کے حق کو پہچاننا اور ان سے الفت اور بشاشت سے پیش آنا حسن معاشرت ہے۔ الغرض یہ ایک طویل بحث ہے اگر تفصیل درکار ہو تو حجۃ اللہ البالغہ میں دیکھئے۔

۱۵۔ کسریٰ وقیصر کا نظام

امام ولی اللہ حجۃ اللہ کے صفحہ ۸۳ میں فرماتے ہیں۔ جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں، اور دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی بنالیا۔ اور آخرت کو بھلا دیا۔ اور شیطان نے ان پر غلبہ کر لیا۔ تو اب ان کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہوگئے، اور ان میں کا ہر شخص سرمایہ داری اور تمول پر فخر کرنے اور اترانے لگا۔ یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہوگئے جو بے جا عیش پسندوں کو دادِ عیش دینے کے لئے عیش پسندی کے نئے نئے

طریقے ایجاد کرنے اور سامانِ عیش مہیا کرنے کے لئے عجیب و غریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے۔ اور قوم کے اکابر اس جد و جہد میں مشغول نظر آنے لگے کہ اسبابِ تعیش میں کس طرح وہ دوسروں پر فائق ہو سکتے اور ایک دوسرے پر فخر و مباہات کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے امرا اور سرمایہ داروں کے لئے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ اُن کی کمر کا ٹپکہ یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو، یا اُن کے پاس عالی شان سر بفلک محل نہ ہوں، جس میں پانی کے حوض، سرد و گرم حمام، بے نظیر پائیں باغ ہوں، اور ضرورت سے زائد نمائش کے لئے بیش قیمت سواریاں۔ حشم و خدم اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں۔ اور صبح و شام رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں۔ اور جام و سبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو۔ اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو۔ اور جس کا ذکر قصہ طولانی کے مرادف ہے۔ غرض یہ غلط اور گمراہ کن عیش ان کے معاشی نظام کا اصل الاصول بن گیا تھا۔ اور کیفیت یہ ہو گئی تھی۔ کہ یہ صرف نواب اور امراء کے طبقہ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا، بلکہ پوری مملکت میں ایک عظیم الشان آفت اور وبا کی طرح سرایت کر گیا تھا۔ اور عوام و خواص سب میں یہی جذبہ فاسد پایا جاتا تھا۔ اور ان کے معاشی نظام کی تباہی کا باعث بن رہا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پر یہ حالت طاری تھی کہ دلوں کا امن و سکون مٹ گیا تھا۔ نا امیدی کاہلی بڑھتی جاتی تھی۔ اور بہت بڑی اکثریت رنج و غم

اور آلام و مصائب میں گھری نظر آتی تھی۔ اس لئے مفرطانہ عیش پرستی کیلئے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی۔ اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی۔ البتہ اس کے لئے بادشاہ، نواب، امراء اور حکام نے معاشی دست بُرد شروع کردی۔ اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشتکاروں، تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کارپردازوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کرکے ان کی کمر توڑ دی۔ اور انکار کرنے پر ان کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کر کے ان کو ایسے گھوڑوں، اور گدھوں کی طرح بنا دیا جو آبپاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ اور پھر کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات و ضروریات کے مطابق بھی کچھ پیدا کر سکیں، خلاصہ یہ کہ ظلم و بداخلاقی کی انتہا ہو گئی تھی۔ اس پریشان حالی اور افلاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو اپنی آخروی سعادت و فلاح اور خدا سے رشتۂ بندگی جوڑنے کے لئے بھی مہلت نہ ملتی تھی۔ اور اس "فاسد معاشی نظام" کا ایک مکروہ پہلو یہ بھی تھا کہ جن صفتوں پر نظامِ عالم کی بنیاد قائم ہے وہ اکثر یک قلم متروک ہو گئیں۔ اور امراء و رؤسا کی مرضیات و خواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بہتر حرفہ شمار ہونے لگا۔ اور جمہور کی یہ حالت تھی کہ ان کی تمام زندگی بداخلاقیوں کا نمونہ بن گئی تھی اور اُن میں سے اکثر کا گزارہ بادشاہوں کے خزانوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہو گیا تھا، مثلاً ایک طبقہ جہاد کئے بغیر باپ دادا کے نام پر مجاہدین کے نام سے وظیفہ خواری کر رہا ہے۔ تو دوسرا امدبرین مملکت کے نام سے پل رہا ہے

کوئی بادشاہ و امراء کی خوشامد میں قصہ خوانی کر کے شاعری کے نام سے وثیقہ پا رہا ہے۔ تو کوئی صوفی اور فقیر بن کر دعا گوئی کے زمرہ میں مالی استحصال کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کسب معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان تھا، اور ایک بڑی جماعت چاپلوسی، مصاحبت، چرب زبانی اور دربار داری کے ذریعہ معاش حاصل کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اور یہ ایک ایسا فن بن گیا تھا جس نے اُن کے افکارِ عالیہ اور ذہنی نشو و نما کی تمام خوبیاں مٹا کر پستی اور ارذل زندگی پر قانع کر دیا تھا...... پس جب یہ فاسد مادہ وبا کی طرح پھیل گیا۔ اور لوگوں کے دلوں تک سرایت کر گیا۔ تو ان کے نفوس دنائت و خست سے بھر گئے۔ اور ان کے طبائع اخلاقِ صالحہ سے نفرت کرنے لگے، اور ان کے تمام اخلاقِ کریمانہ کو گھن لگ گیا، اور یہ سب اُس "فاسد معاشی نظام" کی بدولت پیش آیا جو عجم و روم کی حکومتوں میں کارفرما تھا۔ آخر جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی اور مرض ناقابلِ علاج حد تک پہنچ گیا تو خدا تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا۔ اور اس کی غیرت نے تقاضہ کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے۔ اور اس کا قلع قمع ہو جائے۔ اس نے ایک "نبی امی" (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث کیا۔ اور اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا، وہ آیا۔ اور اس نے روم و فارس کی ان تمام رسوم کو فنا کر دیا۔ اور عجم و روم کے رسم و رواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔ اس نظام میں فارس و روم کے فاسد نظام کی قباحت کو اس طرح ظاہر کیا کہ معاشی زندگی کے

ان تمام اسباب کو یک قلم حرام دیا۔ جو عوام اور جمہور پر معاشی دست برد کا سبب بنتے اور مختلف عیش پسندیوں کی راہیں کھول کر حیات دنیوی میں بیجا انہماک کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً مردوں کے لئے سونے چاندی کے زیورات اور حریر و دیبا کے نازک کپڑوں کا استعمال، اور تمام انسانی نفوس کے لئے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال اور عالی شان کوٹھیوں اور رفیع الشان محلات و قصور کی تعمیر اور مکانوں میں فضول زیبائش وغیرہ کہ یہی فاسد نظام کے ابتدائی منازل اور معاشی نظام کی تباہی کا منشاء و مولد ہیں (اردو ترجمہ از مولینا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ماخوذ از الفرقان بریلی)

..... اور اس کے قائم کردہ نظام نے قیصر و کسریٰ کی دولت کا خاتمہ کر دیا۔ چنانچہ آپ صلعم کا یہ ارشاد صحیح ثابت ہوا کہ کسریٰ ہلاک ہوگا۔ اور پھر اس کا نام و نشان نظر نہ آئے گا۔ اور قیصر کی ہلاکت کے بعد اس کا نام لیوا کوئی نہ ہوگا۔

۱۶ امام عبدالعزیز کا خواب

"امالی عزیزیہ" میں ہے۔ فقیر نے خواب میں دیکھا کہ ایک میدان ہے جس میں سفید براق فرش بچھا ہے۔ اور اس فرش پر بہت سے آدمی بیٹھے ہیں، جن کی شکلیں نورانی اور لباس فاخرہ ہیں۔ اور جناب امیرؓ (علیؓ کرم اللہ وجہہ) کا انتظار کر رہے ہیں۔ فقیر بھی اسی غرض سے فرش پر بیٹھ گیا۔ ناگاہ کیا دیکھتا ہوں کہ جناب امیرؓ قبلہ کی طرف سے نمودار ہوئے۔ اور ہماری طرف تشریف لائے۔ آپؓ کی آمد پر سب لوگ تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور فرش کے کنارے کی طرف

آپ کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھے۔ فقیر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اور چونکہ باعظمت اشخاص کا کافی انبوہ تھا۔ اس لئے میں فرش کے کنارے پر آپ کی پیشوائی کے لئے نہ پہنچ سکا۔ چنانچہ میں فرش کے وسط میں کھڑا تھا۔ جناب امیرؒ تشریف لائے اور صفوں کو چیرتے ہوئے میرے پاس پہنچ گئے۔ اور فرش پر چار زانو بیٹھ گئے۔ میں متادب ہو کر آپ کے مقابل دو زانو بیٹھا۔ آپ نے مجھ پر بہت شفقت فرمائی۔ اور سوائے میرے کسی اور سے کلام نہ کی۔ فقیر نے اس وقت کو غنیمت جانا اور چند ایک چیزیں جو ذہن میں تھیں۔ وہ جناب امیرؒ کی خدمت میں عرض کیں۔ اور آپ نے جواب باصواب ارشاد فرمایا۔

سب سے پہلے آپؒ نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ کسی شخص نے پشتو میں ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے میری تحقیر نکلتی ہے۔ تمہیں اس کی خبر ہے یا نہیں؟ فقیر نے عرض کی کہ بندہ پشتو زبان نہیں جانتا۔ اس لئے اس کتاب سے واقف نہیں۔ خدا نے چاہا تو آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اس امر کی تحقیق کروں گا۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ مذاہب فقہ میں سے کون سا مذہب جنابؒ کو پسند ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مجھے کوئی مذہب بھی پسند نہیں۔ یا آپ نے یہ فرمایا کہ ان میں کا کوئی بھی ہمارا اشعار نہیں۔ کیونکہ ہر مذہب افراط و تفریط میں پڑ گیا ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ تصوف کے طریقوں میں سے کون سا طریقہ جناب کو پسند ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں بھی میرا پہلا سا جواب ہے۔ کیونکہ یہاں بھی اچھی چیزوں کے ساتھ بری چیزیں ملا دی گئی

ہیں۔ اور اس لئے ہمارے خیال میں ان میں خرابیاں پیدا ہوگئیں ہیں لیکن جہاں تک اصل طریقہ کا تعلق ہے۔ ہمارے زمانہ میں تقرب الی اللہ کا مدار تین چیزوں پر تھا۔ اور یہی تین چیزیں عام طور پر مروّج تھیں۔ ذکر، تلاوت، نماز۔ اثنائے زمانے کے بعد آپ یکایک اٹھ کھڑے ہوئے اور جس سمت سے تشریف لائے تھے، اسی طرف تشریف لے گئے۔ اور لوگ جو ان کے انتظار میں تھے۔ حیرت زدہ ہوکر رہ گئے۔

"التمہید" میں (جو مولٰینا کی غیر مطبوعہ کتاب ہے) ہے۔ رجب ۱۱۸۷ھ یا ۱۱۸۸ھ میں شاہ عبدالعزیز نے امیر المومنین علی بن ابی طالب امام انقلاب کو خواب میں دیکھا۔ آپؓ نے شاہ عبدالعزیز کو نظام اجتماع اور اس میں اصلاح کرنے کے طریقوں کی طرف رہنمائی۔ چنانچہ موصوف نے جناب امیرؓ کے ارشادات کی تعمیل کی۔ اور اپنی کوششوں سے عام مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ شاہ صاحب کے اصحاب عام مسلمانوں کی اعانت سے حکومت مؤقتہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔

سیرت سید احمد شہید صفحہ ۷۸ میں مذکور ہے کہ صبح اٹھ کر شاہ صاحب سب سے پہلے حضرت شاہ غلام علی مجددی مظہری متوفی ۱۲۴۰ھ کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ موصوف حضرت مرزا جانجاناں مظہر کے خلیفہ تھے۔ شاہ صاحب نے اُن سے خواب کی تعبیر چاہی۔ شاہ غلام علی نے فرمایا۔ میری سمجھ میں آتا ہے کہ سید حسن رسول نما کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ ان دیار میں ہدایتِ خلق کی طرف بہت کم

ہو گئی ہے۔ اس خواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کے (یا آپ کے کسی مرید رشید کے) ذریعہ وہ سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا۔ شاہ صاحب نے فرمایا میرے خیال میں بھی یہ تعبیر آئی تھی۔

مولینا نور الحق صاحب (مرتب کتاب ہذا) لکھتے ہیں۔ مولینا شیخ عمر فیضہم نے مجھ سے ۲۶ جون ۱۹۴۰ء کو فرمایا کہ یہ خواب امام عبدالعزیز کی عظمت پر دال ہے کہ ان کے عہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی بغیر آپ کے ممکن نہ تھی۔ رہا۔ یہ فقرہ (یا آپ کے کسی مرید رشید کے ذریعہ) ہمارا خیال ہے کہ یہ فقرہ شاہ غلام علی رح کے ذمہ لگا کر محض اس لئے بڑھایا گیا کہ سید احمد شہید کی فضیلت ثابت کی جا سکے۔ ورنہ اصل خواب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(فائدہ) سید حسن رسول نما کا تذکرہ مختصر "خزینۃ الاصفیا" صـــ۱۸۰ میں موجود ہے۔ آپ کی وفات ۱۱۰۳ھ میں ہوئی۔ امام ولی اللہ تفہیمات صـــ۴۴/۲ (خطبہ) میں لکھتے ہیں۔ میر ابوالعلی کے پیروؤں میں سے ایک خواجہ محمد بہار گنج کے قریب رہتے تھے۔ انھیں سید حسن رسول نما کی صحبت نصیب ہوئی تھی۔ موصوف لکھتے ہیں کہ ایک روز سید حسن رسول نما قوالی سن رہے تھے۔ اور اس میں ایسے شعر گائے جا رہے تھے جن میں اپنے آپ کو سگِ محبوب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ آپ اس تشبیہ سے برابر محظوظ ہوتے رہے۔ لیکن ہوتا یہ کہ حظ اور لذت کی یہ کیفیت آتی اور چلی جاتی اور طبیعت اس کیفیت پر جم نہ سکی۔ آپ نے یہ کیا کہ ایک طرف تشریف لے

گئے۔ اور اپنے گلے میں رسی ڈالی۔ اور اس رسی کو میخ سے مضبوط باندھ دیا اور اپنے اوپر جھول ڈالی۔ اور پھر یہ شعر پڑھنا شروع کیا۔ اور اس میخ کے اردگرد گھومنے لگے۔ چنانچہ اس طرح کرنے سے آپ پر لذت کی پوری کیفیت طاری ہوگئی۔ اور اس صورت طبیعت کو "بسط" نصیب ہوا۔

۱۷۔ یلغار نادر شاہ

محمد شاہ کے عہد میں امیر الامراء صمصام الدولہ (متوفی سنہ ۱۱۵۱ھ) کی بے تدبیری سے صوبہ کابل اور سرحدہائے ہند کا انتظام مختل ہوگیا۔ اس کی وجہ سے ہندوستان کو ایک بہت بڑی مصیبت کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ نادر شاہ کا حملہ تھا۔ کابل کا صوبہ دار ناصر خاں گو مرد صالح تھا لیکن وہ سوائے شکار تلاوت و عبادت کے اور کوئی کام نہ کرتا۔ اس زمانہ میں نادر شاہ ایران کے تخت پر قابض ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے ایران سے چل کر قندھار کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ اور ایک سال تک اس کے محاصرہ میں لگا رہا۔ یہاں تک کہ قندھار کے باہر اس نے نادر آباد کے نام سے اپنا ایک شہر بنا لیا۔ اس کے بعد اس نے حملہ کر کے قندھار کو بھی فتح کر لیا اس دوران میں کابل کے صوبہ دار نے صرف اتنا کیا کہ وہ کابل سے بھاگ کر پشاور آ گیا۔ نادر شاہ نے قندھار سے غزنی اور کابل کا رخ کیا اور کابل کو فتح کر کے سات ماہ تک وہاں پڑا رہا۔ بعد ازاں وہ کابل سے جلال آباد آیا۔ اور جلال آباد سے اس نے پشاور کی طرف کوچ کیا۔ اور وہاں سے پنجاب آیا۔ لاہور میں نادر شاہ کے آنے کی خبریں پہنچیں تو شہر میں گھبراہٹ پھیل گئی۔ ۱۵ ذیقعدہ سنہ ۱۱۵۱ھ کو (دہلی کے قریب)

معرکۂ جنگ گرم ہوا جس میں صمصام الدولہ قتل ہوا۔ اور برہان الملک سعادت خاں والئے اودھ اور آصف جاہ نے چند کروڑ روپیہ کے عوض نادر شاہ سے صلح کی طرح ڈالی، ۱۰ ذی الحجہ کو محمد شاہ اور اس کے ایک دن بعد ۱۱ ذی الحجہ کو نادر شاہ قلعہ دہلی میں پہنچے۔ اور عید الضحی کے دن جامع مسجد اور شہر کی دوسری مسجدوں میں نادر شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ ۱۱ ذی الحجہ کا واقعہ ہے کہ بعض ہندوستانیوں نے یہ مشہور کر دیا کہ نادر شاہ چل بسا۔ اس خبر کا پھیلنا تھا کہ نادر شاہ کے سپاہیوں پر جو دو، دو تین، تین کی ٹولیوں میں شہر میں گشت کر رہے تھے حملے شروع ہو گئے اور شہر والے انھیں قتل کرنے لگے۔ غرضیکہ ۱۲ ذی الحجہ کی صبح تک یہ ہنگامہ ہوتا رہا۔ آخر ۱۲ ذی الحجہ کو نادر شاہ کی سواری قلعہ سے نکلی اور اس نے قتل عام کا حکم دے دیا۔ اس حکم پر کوئی نصف روز گزرا تھا کہ امان کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اس کے بعد نادر شاہ نے واپسی کی تیاریاں کر لیں۔ اس نے سندھ اور صوبہ کابل کو سلطنت ایران سے ملحق کر لیا۔ اور پنجاب کے بعض علاقے جن سے صوبہ کابل کا خرچ نکلتا تھا، ان کو بھی اپنے قبضہ میں کیا۔ چنانچہ ۷ ماہ صفر ۱۱۵۲ھ کو نادر شاہ شاہجہاں آباد سے روانہ ہوا۔ (سیر المتاخرین)

۵۹؎ میر اویس

افغانستان میں افغانوں کی قومی حکومت میر اویس سے شروع ہوتی ہے۔ میر اویس قندھار کا حاکم تھا۔ اس نے ایران پر حملہ کیا۔ اور یہ سلسلہ اشقد

چلا کہ ایران میں افغانی حکومت قائم ہو گئی جس کے ردّعمل میں نادر شاہ کا ظہور ہوا۔ میر اویس کی حکومت ایران کی دشمن تھی۔ مگر اس کا تعلق محمد شاہ کی حکومت سے دوستانہ تھا۔ چنانچہ محمد شاہ بھی اس کی سرپرستی کرتا تھا۔ اور اصل میں میر اویس بھی محمد شاہ کا فرماں بردار دوست تھا۔ اس بنا پر سیر المتاخرین کے مصنف کو جو مذہباً شیعہ اور ایرانی شیعہ حکومت کا طرفدار ہے یہ کہنا پڑا۔ "عجیب بات یہ ہے کہ ایران کے صفوی سلاطین نے کسی معاملہ میں کبھی سلاطین ہند سے مدد نہیں چاہی، لیکن اس کے باوجود شاہانِ صفویہ میں سے شاہ اسماعیل صفوی اور شاہ طہماسپ نے بابر اور اسکے بیٹے ہمایوں سے جو مہر و التفات برتا وہ ظاہر و آشکارا ہے، اور گو صفوی بادشاہوں کی ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں سے کوئی غرض وابستہ نہیں تھی، لیکن پھر بھی وہ ان کی طرف سفیر بھیجتے رہتے اور تہنیت و تعزیت کے پیغامات کا سلسلہ ان کے ساتھ جاری رکھتے، لیکن سلاطین ہند نے ان کی اس مہر و محبت اور وفاداری کا پاس نہ کیا۔ چنانچہ ایران میں فتنہ و فساد برپا ہوا۔ اور آخر میں شاہ طہماسپ ثانی اپنے آبا و اجداد کے تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا اور حملہ آور افغان ایران سے نکال بھی دیئے گئے۔ لیکن محمد شاہ نے اس معاملہ میں بالکل خاموشی اختیار کی۔ اور شاہ طہماسپ ثانی کو کوئی تہنیت کا پیغام نہ بھیجا۔ اس کے خلاف اس نے یہ کیا کہ میر اویس افغانی سے آشنائی و مودت کا رشتہ قائم رکھا۔ اور تو اور میر اویس کے بیٹے حسین سے بھی جو آخر میں قندھار کا حاکم تھا اور وہ لشکر لے کر ملتان تک چڑھ آیا تھا۔ اور ان نواح میں اس نے بڑی قتل و غارت اور لوٹ مار کی تھی۔ کوئی پرسش نہ کی۔ اور اس سے خط و کتابت کا سلسلہ

جاری رکھا۔"

واضح رہے کہ مغربی افغانوں نے ایران پر حملہ کیا۔ ان کا سردار محمود خاں تھا اس نے ۱۱۳۴ھ میں اصفہان کو فتح کر لیا۔ اور حسین شاہ صفوی شاہ ایران کو قید کر لیا۔ دار الخلافہ پر قبضہ کر کے وہ خود بادشاہ ہو گیا۔ تین برس سلطنت کر کے ۱۱۳۷ھ میں مر گیا۔ بعد ازاں اس کا رشتہ دار اشرف جانشین ہوا۔ شاہ ایران تو افغانوں کی قید میں تھا۔ مگر شہزادہ طہماسپ وہاں سے نکلکر شمالی مغربی اضلاع میں جواب تک افغانوں نے فتح نہیں کئے تھے، بادشاہ بن گیا۔ ۱۷۲۷ء میں قسمت سے اس کو ایک لائق اور مستقل مزاج آدمی مل گیا۔ اور وہ نادر تھا اس کا اصلی نام نادر قلی خان پسر امام قلی تھا۔ قوم اس کی افشار تھی۔ وہ کچھ رتبہ کا آدمی نہ تھا۔ بعض اس کو پوستین دوز بتاتے تھے۔ نادر کے لڑکے کی شادی جب محمد شاہ کی بیٹی سے ہوئی ہے اور دلہن والوں نے دستور کے مطابق دولھا سے اپنی سات پشت تک نام پوچھے تو نادر نے کہا۔ "بگو داماد شما پسر نادر شاہ است و نادر پسر شمشیر تا ہم چنیں تا ہفتاد بار شمار" نادر ۱۱۰۰ھ میں پیدا ہوا۔ اس کی شہامت و جلادت و سرعت کے کام دیکھ کر عقل دنگ ہوتی ہے کہ ملک کے ملک اور صوبے کے صوبے فتح کرتا چلا گیا۔ سب سے عظیم الشان کام اس کا یہ تھا کہ اس نے ایران کو ۱۱۴۳ھ میں بالکل پٹھانوں سے پاک صاف کر دیا تھا۔ اس کے عوض بادشاہ نے اپنی سلطنت (صوبہ خراسان۔ مازندران، سیستان کرمان) اس کو بخش دئے۔ اس نے ۱۱۴۸ھ میں ایران کی سلطنت کو وہ وسعت دی کہ اس کی حدود اپنی قدیمی صورت پر قائم ہو گئیں ۱۱۵۰ھ میں خاندان صفویہ کا خاتمہ ہوا۔ اب وہ مستقل بادشاہ بن گیا اور ۱۱۵۱ھ میں ہندوستان پر آندھی کی

طرح چڑھ آیا۔ تاریخ ذکا، اللہ ص ۲۴۸/۹

۹۱ احمد شاہ ابدالی

۱۱۶۰ھ میں نادر شاہ اپنے ملازموں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ احمد خاں درانی پہلے نادر شاہ کے ہاں یسادل تھا۔ پھر رفتہ رفتہ بڑا افسر بن گیا۔ جب نادر مر گیا۔ تو خود غزنیں اور قندھار پر مسلط ہو گیا۔ اور وہاں اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کرایا۔ نادر شاہ کے زمانے سے ناصر خاں صوبہ دار کابل تھا۔ احمد خاں ابدالی نے بھی اس کو بدستور اپنے عہدہ پر قائم رکھا۔ مگر پانچسو سوار درانی اس کے ساتھ کئے۔ تاکہ پانچ لاکھ روپیہ جس کے دینے کا اس نے وعدہ کیا تھا ابھی بھیج دے۔ ناصر خاں کابل پہنچ کر وعدے سے پھر گیا۔ احمد شاہ نے اس پر لشکر کشی کی وہ بھاگ کر پشاور پہنچا جب احمد شاہ اس طرح سرحد پر آیا تو اس نے سرحد اور پنجاب کا برا حال دیکھا اس پر وہ لاہور کی طرف بڑھا۔ جب محمد شاہ کو خبر ہوئی تو اس نے دلی سے ایک فوج جرار روانہ کی۔ احمد شاہ لاہور پر قابض ہو کر ستلج کے کنارے پہنچا۔ اسکے پاس بارہ ہزار سے زیادہ فوج نہ تھی۔ کیونکہ وہ فوج کی کثرت کے بجائے اس کی طاقت و قوت پر زیادہ اعتماد رکھتا تھا۔ ۱۳ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ کو اس نے سرہند پر قبضہ کر لیا۔ اور آگے بڑھا۔ ستلج کے کنارے ۱۵ ربیع الاول سے ۲۸ ربیع الاول تک دونوں فوجوں میں سخت جنگ ہوئی۔ اسی اثناء میں جاوید خواجہ سرا نے جو بادشاہ کے منہ بہت چڑھا ہوا تھا۔ شاہ درانی کو صلح کا پیغام دیا۔ بادشاہ محمد شاہ نادر گردی دیکھے ہوئے تھا۔ اس نے ملتان اور لاہور ہر دو صوبے دے کر صلح کر لی۔ اور غنیمت جانا کہ بلا ٹلی۔ احمد شاہ ہر دو صوبے معین الملک پسر قمر الدین خاں

کو دے واپس چلا گیا۔ پھر ۱۱ستمبر ۱۱۷۱ھ کو دوبارہ دہلی آیا۔ اور دلی کو اس طرح لوٹا کہ نادرگردی کو بھی مات کر دیا۔ وہ خود تو نادر کی طرح سفاک و بے رحم نہ تھا۔ مگر اس کی سپاہ نادری سپاہ کی نسبت زیادہ اجڈ تھی۔ لوٹ کا کام دو ماہ تک جاری رہا۔ بعد ازاں سلطنت کے حصے اپنی مرضی سے کر کے امراء میں تقسیم کئے اور شوال ۱۱۷۱ھ کو واپس گیا۔ سیر و تاریخ ذکاء اللہ۔

نمبر ۲ ہندوستان کے افغانی صوبے۔

ہندوستان ایک مملکت کا نام نہیں ہے۔ یہ در اصل عبارت ہے۔ ایک برِ اعظم سے جو بہت سے ملکوں پر مشتمل ہے۔ شیخ محمد قاسم انیسویں صدی کی تاریخ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہندوستانی ایک قوم نہیں ہے بلکہ یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں کا، جو نسل، زبان، دین اور اپنی عادات کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں۔ مشہور مؤرخ مسعودی لکھتا ہے کہ اہل علم و نظر و بحث میں سے ایک جماعت کا بیان ہے کہ عہد قدیم میں ہندوستان بڑی عزت و رفعت کا مالک تھا۔ جہاں نیکی اور دانائی کا دور دورہ تھا۔ ہوتے ہوتے ایک زمانہ ایسا آیا کہ ہندوستان میں ایک سلطنت کی بنا رکھی گئی۔ چنانچہ اس کا پہلا بادشاہ برہما اعظم تھا۔ اس نے حکماء کو جمع کیا۔ اور اسی کے عہد میں کتاب "السند ہند" لکھی گئی۔ اور دھر لدھور" کے نام سے اس کی تفسیر مرتب ہوئی۔ اس سے بعد میں مجسطی جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ اور مجسطی کا نتیجہ بطلیموس کی کتاب ہے۔ برہما کی شخصیت کے بارے میں بڑے اختلافات ہیں۔ بعض اُسے حضرت آدم علیہ السلام سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اور

بعض کا خیال یہ ہے کہ برہما بادشاہ کا نام ہے۔ اور یہی بات زیادہ مشہور ہے۔ ہندوستان ایک وسیع وعریض رقبہ ہے۔ اس میں بڑے بڑے میدان دریا اور پہاڑ ہیں۔ ہندوستان ایک طرف خراسان سے ملا ہوا ہے۔ اور دوسری طرف تبت سے۔ اور ان ملکوں کے درمیان پہاڑ حد فاصل ہیں۔ ان ملکوں کے درمیان لڑائیاں اور جھگڑے رہتے ہیں اور یہاں کے رہنے والوں کی زبانیں جُدا جُدا اور رائیں مختلف ہیں۔ چلپی اپنی کتاب "کشف الظنون" میں لکھتا ہے۔ ہندوستان والے اعلیٰ آرار اور عمدہ احکام کے مالک رہے ہیں۔ انہوں نے حساب، ہندسہ، طب، نجوم اور دوسرے طبعی اور الٰہی علوم میں بڑی بڑی تحقیقات کیں۔ ہندوستان کے عام جمہور صابئی ہیں۔ اور کواکب کی تعظیم اور ان کے دوروں کے متعلق ان کی خاص رائیں اور مسلک ہیں۔ آزاد بلگرامی "سبحۃ المرجان" میں لکھتا ہے۔ ہندوستان میں کبھی دہلی، سندھ، دکن اور سیلون تک کے علاقہ کو شمار کر لیا کرتے ہیں۔ کابل ہندوستان اور خراسان کے درمیان ایک برزخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور زمانہ دراز سے یہ ہندوستان کی مملکت میں شامل ہے۔ اور بعض دفعہ ہندوستان سے صرف دہلی کی سلطنت مراد ہوتی ہے۔

میرے (مولینا) نزدیک وہ علاقے جہاں کے دریا بہہ کر دریائے سندھ میں ملتے ہیں مثلاً کابل اور ہندوکش پہاڑ کے جنوب کے اطراف۔ اور نیز وہ اضلاع جہاں پشتو بولی جاتی ہے۔ جیسا کہ قندھار اور اس کے ارد گرد کا رقبہ ہے یہ سب کے سب ہندوستان کا ایک حصہ ہیں۔ اور پشتو اصل میں سنکرت

زبان سے ہی نکلی ہے ۔میرے خیال میں حکومتوں کے الگ الگ ہونے سے یہ سرزمین ہندوستان سے جدا نہیں ہو سکتی ۔اور میں نے تمام تاریخی شواہد کو اپنے اس دعویٰ کا موید پایا ہے۔اس میں شک نہیں کہ بعض مسلمان مورخ اس علاقہ کو ہندوستان سے الگ مانتے آئے ہیں لیکن یہ ان کی بھول ہے۔انہوں نے کبھی اس رقبہ کی زبان ۔اور یہاں کے مقامات کے ناموں کی تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی۔مولوی ذکاراللہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں" عربی میں غیر قوموں کے ناموں کی تعریب کے لکھنے کا قاعدہ اختیار کیا گیا ہے۔اس سبب سے ناموں کا پتہ لگانا نہایت دشوار ہے۔فرنگی محققین نے ان ناموں کی تحقیق میں بہت سے کورے کاغذ سیاہ کئے ،مگر بے سود ۔ان ناموں کی تحقیق دراصل اُن محققین کا کام ہے جو عربی اور سنسکرت ہر دو زبانوں کے فاضل ہوں۔ وہ سنسکرت دانی سے تحقیق کر سکتے ہیں کہ اصل نام کیا تھا۔اور عربی دانی سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ کیونکر اس کی تعریب ہوئی ۔ایک تاریخ میں لکھا ہے کہ بادشاہانِ کابل کا نام رنتبیل تھا۔کوئی رنبیل ،کوئی زنبیل ،کوئی زبیل کوئی رت بل ۔کوئی رن ھٹیل اور کوئی اُسے رن بل لکھتا ہے۔ یہ ایک بامعنی ہندو نام ہے ۔یہ بھی محققین نے تحقیق کی ہے کہ کابل میں جو ترک کوہستان تبت سے آئے تھے ان کا مذہب بدھ تھا۔ان ترکوں سے برہمنوں کے ہاتھ اور برہمنوں سے راجپوتوں کے ہاتھ سلطنت منتقل ہوئی"۔

میرے (مولینا) خیال میں جب تُرک یہاں آئے اور انہوں نے اپنی بستی بسائی تو یہ جگہ گایوں کی چراگاہ تھی اور اس کا نام "گئو پال" تھا

پھر گویا بال بگڑ کر کابل بنا۔ اور جب مسلمانوں نے کابل پر حملہ کیا تو یہاں کا حاکم "رام بال" نامی تھا جس کے نام کو بگاڑ کر انہوں نے زنبیل بنا دیا۔ واللہ اعلم۔

اہلِ حنفی فقہ

امام ابو حنیفہ انقلابی سیاست کے مالک تھے۔ آپ فقہ کو ایسے طریقہ پر مرتب کرنا چاہتے تھے۔ کہ ایرانی ذہنیت اُسے آسانی سے قبول کر سکے۔ کتاب وسنت سے استنباط عرب کی ذہنیت کے لئے بہت مناسب ہے۔ وہ قرآن عظیم بچپن سے سمجھتے ہیں۔ احادیث اور آثار کے متعلق بھی ان کے علمار کو فی الجملہ علم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اکثر مسائل کتاب وسنت سے بہ آسانی مستنبط ہو سکتے ہیں۔ البتہ بعض دقیق مسائل میں وہ کسی امام کی تقلید پیدا کر لیتے ہیں۔ اسی سے وہ شافعی یا مالکی کہلاتے رہے۔ مگر جب خلافت کا نظام ایرانیوں کے ہاتھ آگیا۔ اور ان کی ذہنیت اس طرز تفقہ کی معتاد نہیں تھی۔ چنانچہ وہ ہر چیز کو ایک عقلی اصول کے اندر حل کرنا ضروری جانتے تھے۔

عام طور پر یہ لوگ امام ابو حنیفہ کی فقہ پر ایک اعتراض وارد کیا کرتے ہیں کہ اس میں عامہ اہل سنت سے تفرد اختیار کیا گیا ہے۔ اور یہ امام ابو حنیفہ کی ذہنی تاثیر کا نتیجہ ہے۔ ہم نے جب "کتاب الآثار" للامام محمد پڑھی تو ہمیں اس شبہ پر ہنسی آئی۔ ہر ایسا قول جس میں امام ابو حنیفہ عام اہل علم سے متفرد سمجھے گئے اور اس کو شاذ قرار دیا گیا۔ وہ اقوال سب کے سب ابراہیم نخعی سے

منقول پائے۔ ابراہیم نخعی عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں ایک مسلّم امام ہیں۔ سفیان بن سعید ثوری بھی انہی کے طریقے کے ایک عالم ہیں۔ آگے چل کر امام بخاری کا ابراہیم نخعی سے خصوصی انتساب ہے۔ بخاری اسحاق سے، وہ عبداللہ ابن مبارک سے، وہ سفیان ثوری سے، وہ تلامذہ ابراہیم نخعی یعنی منصور اعمش۔ حماد۔ حکم سے روائت کرتے ہیں۔ وہ اول الذکر سفیان کے حدیث میں اور دو آخر الذکر فقہ میں ان کے استاذ ہیں۔ امام ابوحنیفہ کا یہ خصوصی کمال ہے کہ وہ ابراہیم کی فقہ کو معقول بنا دیتے ہیں۔ اور اس میں سے آئندہ ضرورت کے مطابق مسائل استنباط کرنے کے لئے قواعد وضع کر دیتے ہیں۔ اگر وہ یہ کام نہ کرتے تو ایرانی فقہا اور منتظمین خلافت کبھی اسلامی فقہ کو چلا نہ سکتے۔

امام ابوحنیفہ کا یہ ایسا احسان ہے جس کی اُمت اسلامیہ ہمیشہ ممنون رہے گی۔ مگر اس کے ساتھ انقلابی سیاست اس فقہ کو کامیاب ہونے نہیں دیتی تھی۔ عام اہل علم ان کا نام سن کر بھاگتے تھے کہ کہیں ہم بھی حکومت کے عتاب میں نہ آجائیں۔

امام ابویوسف نے اس مشکل کو حل کر دیا۔ یہ عباسی خلافت کے ساتھ ہوگئے۔ اور امام صاحب کے مسلک یعنی علویوں کی تائید سے دست کش ہوگئے۔ اس طرح عباسی خلافت کو چلانے کے لئے جس قدر قانون کی ضرورت تھی۔ انہوں نے امام ابوحنیفہ کی فقہ سے مدون کر اُسے منظم کر دیا۔

بات یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے تک تو فقہا کا مرجع خلیفہ راشد رہا۔ فقہا اپنے اجتہاد پر عمل کرتے اور ان کا اختلاف مُضر شکل میں

ظاہر نہ ہوتا تھا۔ اس لئے کہ ان کے عمل کے لئے زمینیں مختلف تھیں۔ مثلاً ایک فقیہ نے مغرب میں ایک طرح کا حکم دیا۔ دوسرے نے مشرق میں اس کے خلاف کہا۔ لوگوں کو یہ علم ہی نہ ہو سکا۔ کہ یہ دو فقیہ مختلف رائے رکھتے ہیں۔ اس لئے کوئی دقت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ البتہ حجاز میں یا مدینہ منورہ میں (بہ زمانِ خلیفہ راشد) اگر فقہا کا اختلاف ظاہر ہوتا تو خلیفۂ راشد کا حکم اس کا فیصلہ کر دیتا۔ اس سے وہ اختلاف بھی ضرر کے درجے تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔

اس کے بعد بنی امیہ کے دور میں ساری توجہ فتوحاتِ اسلامیہ پر مرکوز رہی۔ اور فقہا کا طرزِ عمل ویسا ہی رہا۔ جیسے خلافت راشدہ میں تھا۔ یعنی مختلف ممالک میں اگر کوئی اختلاف تھا۔ تو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا تھا۔ ادھر صوبہ کے گورنر کو اپنے لئے قاضی مقرر کرنے کا اختیار حاصل تھا۔

جب کبھی مرکز خلافت میں نزاع پیدا ہوتا۔ تو بنی امیّہ کا خلیفہ اتنا علم رکھتا تھا کہ وہ فقہا کے مختلف اقوال سن کر ایک قول کو ترجیح دے سکے۔ ہم نے خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے بعض فتاویٰ ایسے دیکھے کہ آج تک فقہا اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور اگر خلیفہ ترجیح سے عاجز آجاتا تو فقہاء مدینہ کا فیصلہ دریافت کر لیتا۔ واضح رہے کہ بنی امیہ نے علمی مرکز دمشق میں منتقل نہیں کیا تھا۔ عباسیوں نے سیاسی مرکز اگر بغداد کو بنایا تو علمی مرکز بھی وہیں منتقل کر لیا۔ اسی لئے ان کے خلیفہ نے امام مالکؒ سے کہا کہ موطا کی تعلیم کے بجائے مدینہ کے بغداد میں آکر دیجئے۔ مگر امام مالک مرکز کو چھوڑنے پر کب تیار ہو سکتے تھے؟ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

عباسی دور میں نئی چیز پیدا ہوتی ہے۔ مدینہ منورہ کے بجائے بغداد علمی مرکز بنتا ہے۔ اور خلیفہ میں اتنی علمیت نہیں کہ وہ ترجیح دینے کی استعداد رکھتا ہو۔ جیسے بنی امیہ کے خلفاء میں تھی تمام خلافت کے اطراف بعیدہ سے مختلف فتاوی مرکز میں جمع ہونے لگے۔ اس لئے کہ اب حکمراں طاقت ایرانی ہے وہ کسی فقیہ کے فتویٰ کو نہ سمجھ سکتی ہے نہ ترجیح دے سکتی ہے۔ صوبہ کے گورنروں کے اختیار معطل ہیں۔ اس لئے ہر اختلاف کو وہ بھی مرکز کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔

ان حالات میں خلیفہ کے ساتھ ایک زبردست عالم کا ہونا ضروری تھا، جو اس ایرانیت کے تمام جھگڑوں سے اُس کو نجات دلا سکے۔ اس کے لئے پہلے پہل خلیفہ منصور نے سعی کی کہ اہل مدینہ اس کے طرف دار بنیں۔ مگر ان کا توافق نہیں ہو سکا۔ منصور محتاج ہوا کہ اہل عراق کے فقہاء سے استمداد کرے۔ وہ امام ابوحنیفہ کو اس کا اہل سمجھتا تھا۔ مگر حضرت امام کے سیاسی اختلافات کے باعث وہ اُن سے استفادہ نہ کر سکا۔ امام ابویوسف نے یہ ہمت دکھائی اور تمام ممالکِ خلافت کی قضا کو منظم کر دیا جس سے آپ کا لقب قاضی قضاۃ العالم ہوا۔ عدالتوں میں مراتب قائم کر کے خلافت کو اپیل کی آخری عدالت بنا دیا۔ اس کے لئے ضروری تھا۔ کہ تمام قلمرو میں ایک ہی قانون نافذ ہو۔ امام ابویوسف نے امام ابوحنیفہ کی فقہ پر غور کر کے ایک قابل عمل نظام نامہ مرتب کر لیا اور امام محمد بن حسن شیبانی کو اس کی تعلیم کے لئے مخصوص کر دیا۔ اب جو قاضی امام محمد کے یہاں سے پڑھ کر نکلے گا، فقط وہی کسی مملکت میں قاضی بنایا جائے گا۔ چھوٹے قاضی وہ اپنے تلامذہ سے منتخب کر کے مقرر کرے گا۔ اس طرح ان

دو بزرگوں (ابو یوسف و محمد) کے اتفاق سے تمام ممالکِ خلافت ایک قانون کے پابند ہو گئے۔

یہ خلافتِ عباسیہ کا سب سے قابلِ فخر زمانہ ہے۔ اس میں امام ابو حنیفہ کا کمال جس قدر مانا جائے گا۔ اس کے ساتھ امام ابو یوسف اور امام محمد بھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ یہ ہے فقہ حنفی اور ائمہ حنفیہ کی حقیقت۔

ہماری سمجھ میں جو کام امام ابو یوسف اور محمد ہر دو نے کیا، شاہ ولی اللہ کی فقہ، تصوف اور حدیث کو رواج دینے میں اکیلے امام عبدالعزیز نے کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے دو بھائی شیخ رفیع الدین اور عبدالقادر ان کے معاون تھے۔ مگر فیصلہ کن رائے فقط شاہ عبدالعزیز کی ہوتی تھی۔ ان کی اس اطاعت نے ہندوستان کو عالمگیر کے بعد پھر ایک دفعہ ایک قانون (فقہ حنفی عزیزی) کا پابند بنا دیا۔ اب آپ ہندوستان میں کوئی عالم حنفی نہیں پائیں گے جس پر شاہ عبدالعزیز کا احسان نہ ہو۔ مارق اور باغی ہر اجتماع میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے کوئی اجتماعی قوت بدنام نہیں ہو سکتی۔

۲۲ ہندوستان میں شیعی دعوت

سلطان محمود نے ۳۹۱ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ اور پشاور کے قریب مقام ہنڈ پر جے پال والئے لاہور کی فوج کو شکست دی۔ نواحِ ملتان میں سلطان سے پہلے قرامطہ نے اپنی سلطنت قائم کر رکھی تھی۔ ملتان کا مشہور عظیم الشان مندر جسے شیخ الاسلام محمد بن قاسم ثقفی نے محض اس لئے نہ چھیڑا تھا کہ وما البد الا کنائس النصاریٰ والیھود و بیوت النیران للمجوس۔ قرامطہ

نے اس کو مسمار کر کے وہاں اپنا گورنمنٹ ہاؤس تعمیر کر لیا تھا۔ سلطان محمود نے قرامطہ کو شکست دے کر اس عمارت کو مسجد کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ اس واقعہ پر ایک زمانہ گزرنے کے بعد جب ہمایوں اپنے لڑکے اکبر کے ساتھ ہندوستان سے فرار ہوا تو وہ سیدھا شاہ اسمٰعیل صفوی کے پاس ایران پہنچا۔ اس نے ایرانی حکومت سے ایک باقاعدہ معاہدہ کر کے ایران سے فوجی امداد لی۔ اور پھر کامیاب ہوا۔ وہ معاہدہ کیا تھا؟ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ ہمارے نزدیک ہندوستان مستقل خلافت کا مستحق ہے۔ اکبر نے اپنی خلافت کا دعویٰ کیا۔ اس لئے کہ ہمایوں ایران کی تابعداری کا وعدہ کر آیا تھا۔ اور اکبر کو ملکی حکومت پیدا کر کے استقلال کے دعوئ کی ضرورت ہوئی۔ اس نے ہندوؤں کو ساتھ ملایا تاکہ ملکی حکومت پیدا ہو اور ایرانی حکومت سے کہا جا سکے کہ جس حکومت نے تابعداری کا وعدہ کیا تھا وہ نہیں رہی۔ اس کی بجائے ایک نئی قومی ملکی حکومت قائم ہے۔ جسے معاہدہ معلومہ سے ذرہ برابر تعلق نہیں۔ واضح رہے کہ ہندوؤں کا ملانا اکبر کی ایجاد نہیں۔ شیر شاہ، فیروز شاہ، ناصر الدین حسن، یہ کام پہلے کر چکے تھے۔ مگر ملکی حکومت بنانا یہ اکبر کی ایجاد اور اس کی اختراع ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بیرم خاں والد عبدالرحیم خانخاناں کے توسل سے ہمایوں کا معاہدہ شاہ ایران سے طے ہوا، ورنہ شاہ ایران ہمایوں کو امداد دینا دل سے کسی طرح نہیں چاہتا تھا۔ جب ہمایوں نے منظور کر لیا کہ میں شیعہ مذہب کو وہاں رائج کروں گا۔ اور شیعہ ریجنٹ (بیرم خاں) کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ تو کہیں جا کر امداد دی گئی۔ جب اکبر تخت نشین ہوا اور

اس کو اپنی سلطنت کی حقیقت سمجھ میں آئی۔ تو سب سے پہلے اس نے بیرم خاں کو علیحدہ کیا۔ بیرم خاں کی ایران کی راہ سے حج کو جانا چاہتا تھا۔ اکبر نے اس کو روک دیا اور پھر قتل کرا دیا۔ اس کے بعد کوئی ریجنٹ ایران سے ہندوستان کو نہیں آیا۔ اکبر نے شیعیت کی بنیاد کاٹنے کے لئے ہندوستان سے اسلامی حکومت کو ختم کر کے اس کی بجائے ملکی حکومت پیدا کی۔ اب اس پر نہ تو کوئی سُنی خلیفہ زور ڈال سکتا تھا۔ اور نہ کوئی شیعہ بادشاہ تحکم چلا سکتا تھا۔ اکبر جیسا انصاف پسند بادشاہ ہندوستان نے پیدا نہیں کیا۔ قانون کے سامنے اس کا بیٹا اور دشمن دونوں مساوی تھے۔

شمالی ہند کے علاوہ جنوبی ہند میں گولکنڈہ شیعوں کا مرکز تھا۔ جہاں تانا شاہ برسر حکومت تھا اور جسے سلطان عالمگیر نے ختم کر دیا۔ آواخر ذی قعدہ ۱۰۹۸ھ میں ابوالحسن گرفتار ہو کر دولت آباد کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ سیر المتاخرین کا شیعہ مصنف لکھتا ہے "گولکنڈہ کے قلعہ کے استحکام اور سرزمین حیدرآباد کی خوبی اور اس کی آب وہوا کی لطافت کو کوئی کہاں تک بیان کرے۔ وہاں کا بادشاہ ابوالحسن لہو ولعب اور عیش وطرب میں اوروں سے زیادہ منہمک ہو گیا۔ اور اس کی وجہ سے ملک میں بھی فسق وفجور کا عام رواج ہوا۔ عالمگیر نے جو بظاہر اپنے آپ کو اہل صلاح میں سے بتلاتا تھا۔ اور اپنے آپ کو تارکین دُنیا کی شکل میں ظاہر کرتا تھا۔ حیدرآباد کو دار الجہاد قرار دیا۔ چنانچہ وہاں کے باشندے بیدریغ قتل کئے گئے اور اس شہر کو تباہ وبرباد کر دیا گیا۔ اصل میں عالمگیر کا مقصد ابوالحسن کے شہرۂ آفاق خزانوں کو ہتھیانا اور وہاں کے علمار شیعہ کا استیصال

کرنا، اور عام مؤمنین کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنانا تھا۔

اس کے بعد محمد شاہ کے آخری عہد میں لکھنؤ شیعوں کا مرکز تھا۔ اس مرکز سے دہلی پر غلبہ حاصل کرنے کی مسلسل سعی جاری رہی۔ اس کو روکنے کے لئے شاہ عبدالعزیز نے "تحفۂ اثنا عشریہ" کی دیوار کھڑی کی۔ جب عوام شیعہ کے پراپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں تب کہیں انھیں "ازالۃ الخفا" پڑھائی جاسکتی ہے۔

الخطیب، ابی زرعہ رازی سے روایت کرتے ہیں کہ "انھوں نے کہا کہ جس شخص کو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں نقص نکالتے پاؤ۔ اس کو زندیق سمجھو۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ رسول حق ہیں، قرآن حق ہے اور رسول نے جس امر کی دعوت دی وہ بھی حق ہے۔ اب رسول، قرآن اور رسول کی دعوت کا سارا حال ہمیں صحابہ کے واسطے سے معلوم ہوا۔ چنانچہ صحابہ کے نقص نکالنے والے اصل میں کتاب اور سنت کو باطل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ بیشک یہ لوگ زندیق ہیں" اصابہ صفحہ ۱۰

ہارون الرشید کے سامنے زندیقوں کا سردار شاکر لایا گیا۔ ہارون نے اس کی گردن مارنے کا ارادہ کیا۔ اسی سلسلہ میں شاکر سے پوچھا گیا کہ تم لوگ سب سے پہلے اپنے شاگردوں کو صحابہ کے انکار اور "قدر" کی تعلیم کیوں دیتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ صحابہ کے انکار سے دوسرے لفظوں میں یہ مقصود ہے کہ جس دین کو وہ نقل کرتے ہیں، وہ باطل ہے۔ کیونکہ جب نقل کرنے والا مشکوک ہے تو جو چیز وہ نقل کرے گا وہ کس طرح قابل اطمینان ہو سکتی ہے۔ خطیب بغداد ص ۳۰۸/۴ امام فضل اللہ۔

شیخ سعدی کے معاصر تورپشتی حنفی جن کے حالات "طبقات السبکی" میں ہیں، اپنی کتاب "المعتمد" باب سوم فصل چہارم میں لکھتے ہیں، "جو لوگ ابوبکرؓ کی خلافت پر اعتراض کرتے ہیں، وہ گویا تمام صحابہ پر زبانِ طعن کھولتے ہیں اور صحابہ کو مطعون کرنا در اصل دین کے اساس کو مطعون قرار دینا ہے۔ کیونکہ قرآن حدیث اور ان کے متعلقہ احکام ہم تک صحابہ ہی کے واسطہ سے پہنچے ہیں، اگر صحابہ ان کے قول کے مطابق غلط رو تھے تو ظاہر ہے جو چیز انہوں نے نقل کی وہ کس طرح قابل اعتبار ہو سکتی ہے۔ الغرض صحابہ کو اس طرح مطعون کرنے سے شریعت ہی کالعدم ہو جاتی ہے۔" الیواقیت والجواہر للشعراوی ص ۲۲۶

۲۳ مولینا رفیع الدین

مولینا رفیع الدین کی تصنیف "اسرار المحبۃ" کا ایک قدیم نسخہ پرنسپل مولوی محمد شفیع صاحب اورنٹیل کالج لاہور کی لائبریری میں موجود ہے۔ گذشتہ ماہ اگست سنہ ۱۹۴۱ء میں خاکسار راقم نے اس سے استفادہ کیا۔ نقل لینے کا ارادہ تھا۔ لیکن ناگہاں بیمار پڑنے کے باعث یہ کام سرانجام نہ پا سکا لعل اللّٰہ یحدث بعد ذٰلک امرا۔ رسالہ مذکورہ میں یہ دکھایا ہے کہ محبت سب اشیاء میں ساری ہے۔ اور قرآن حکیم کی جس قدر آیتیں محبت کے متعلق تھیں۔ ان کو ساتھ ساتھ حل کرتے جاتے ہیں۔ اس موضوع پر صرف فارابی اور بوعلی سینا نے کچھ لکھا ہے۔ بوعلی سینا کا قصیدہ ان کے پیش نظر ہے۔ یعنی "ھبطت الیک من المکان الارفع الخ۔ اس کے جواب میں آپ نے ایک قصیدہ طنانہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے۔

عجباً لشیخ فیلسوف المعی　　خفیت علیہ منادۃ من مشرع

مقطع یہ ہے۔ ثم الصلوٰۃ علی النبی و آلہ   والحمد للہ العلی الارفع

رسالہ محبتہ کے تین جز ہیں۔ تحصیل، تذییل، تفصیل۔ دیکھو ابجد العلوم صفحہ ۲۵۴

رسالہ تکمیل الاذہان کا اکثر حصہ ابجد العلوم میں آچکا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحات ۱۲۰ تا ۱۳۲ و ۲۳۵ تا ۲۷۰ بالفاظ دیگر حصہ منطق کے ماسوا ساری کتاب ابجد میں آگئی ہے۔ اس کتاب کے مختلف نسخے حسب ذیل مقامات پر موجود ہیں۔

(۱) پیر صاحب العلم سندھ کی کتاب خانہ میں اس کا ایک نسخہ تھا جس سے راقم عاجز نے اپنا نسخہ نقل کیا اور نسخہ منقولہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے (۲) حافظ عبدالعزیز ولد مولوی احمد صاحب بہاولپور (۳) مولوی عبدالتواب ملتانی (۴) مولوی عبدالعزیز یا مولوی عبدالتواب کے نسخے سے مولانا نجم الدین صاحب سابق ہیڈ مولوی اورنٹیل کالج نے اپنا نسخہ نقل کرایا۔ (۵) مولوی سلطان محمود ملتان۔ شاہ رفیع الدین کی تصانیف کی ایک عام خصوصیت شیخ محسن نے "یانع جنی" میں یہ بیان کی ہے۔ کہ ان میں بکثرت رموز خفیہ درج ہوتی ہیں۔ جن پر بہ مشکل اطلاع نصیب ہوئی ہے۔ نیز یہ کہ وہ تھوڑے سے الفاظ میں جہانِ معنی آباد کر دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں خصوصیتیں تکمیل الاذہان میں نمایاں ہیں۔ کتاب مذکور میں چار باب ہیں۔ منطق۔ فن تحصیل۔ امور عامہ۔ تطبیق الآراء ایسی جامع کتاب پہلے نہیں لکھی گئی۔ (نور الحق علوی)

۳۔ رسالہ حملۃ العرش کا تذکرہ شیخ محسن نے یانع جنی میں کیا ہے۔ تفسیر عزیزی مطبوعہ بمبئی میں تفسیر سورۃ الواقعہ "آیت ویحمل عرش ربک فوقہم یومئذٍ ثمانیۃ

شاہ عبدالعزیز نے وہ رسالہ نقل کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں "برادر فضائل آئین کمالات آگین شیخ محمد رفیع الدین سلمہ اللہ وزادہ فی الدُنیا والدین فتوحاً دبی کاتاً مّتواتراً ومتوالیا۔ در بعضے تصنیفات خود چنیں نوشتہ اند کہ حملۃ العرش جمعے باشد کہ حامل کمالات اربعہ الٰہیہ اند۔ یعنی ابداع وخلق وتدبیر وتدلّی" الخ ص۹۹۔ مگر گمان غالب یہ ہے کہ منقول شدہ عبارت رسالہ مذکورہ کا ٹکڑا ہے۔ پورا رسالہ نہیں (واللہ اعلم محمد نورالحق)

تفسیر آیت نور۔ شیخ محسن نے "یانع جنی" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ تفسیر آیت اللہ نور السموٰت والارض" میں رسالہ "سطعات" از حکیم الہند امام ولی اللہ موجود ہے۔ شاہ رفیع الدین کا یہ رسالہ اسی کی تکمیل ہے۔ دوسرے حکماء اس مسئلے کو کس طرح حل کرتے ہیں، وہ سب اقوال اس میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں ایک نئی بات یہ ہے۔ کہ پہلے حکماء کے چار فرقے بیان کئے جنہوں نے حقائق اشیاء میں بحث کی ہے۔ پانچویں فرق کا امام اپنے والد ماجد کو لکھا ہے۔ کہتے ہیں۔ هو اعمهم فکرا و اجمعهم علماً یعنی وہ فکر وسیع اور جامعیت رکھتے ہیں۔ پھر ہر ہر مسئلے میں پانچوں مذہب علیحدہ علیحدہ نقل کرتے جاتے ہیں۔ وہ مذاہب حسب ذیل ہیں۔ سلف اہل حدیث۔ متکلمین۔ صوفیہ کرام۔ حکما (اشراقیہ ومشائیہ) یہ چاروں فرقے حقائق اشیاء یعنی ان کی حکمت سے بحث کرتے ہیں۔ لیکن امام ولی اللہ کا مسلک ان سب سے اجمع۔ اعم۔ اتقن ہے۔ رسالہ مذکورہ کا ایک نسخہ ریاست بہاولپور۔ احمد پور شرقیہ۔ مولوی عبدالعزیز ولد مولوی احمد صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ہمارے پاس بھی مکہ معظمہ میں اس کی ایک نقل پہنچی۔ معلوم نہیں کہ ہماری کتابوں کے ساتھ اس کو بھی ہندوستان لایا گیا ہے یا نہیں۔

۲۴۔ شیخ خالد کردی

حضرت شیخ غلام علی (عرف عبداللہ) مجددی مظہری "مجدد مائۃ ثالث عشر" شمار ہوتے ہیں۔ دہلی کی خانقاہِ مجددیہ انھیں کے نام سے آباد ہے۔ آپکی ذات سے اس قدر فیض جاری ہوا کہ بقول شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی شاید ہی اگلے مشائخ میں کسی سے اس قدر فیض ہوا ہو۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا شہر تھا۔ جہاں آپ کا کوئی خلیفہ نہ ہو۔ صرف ایک شہر انبالہ میں آپ کے پچاس خلفا تھے۔ آپ ہی کے خلیفہ شیخ خالد کردی تھے۔ جن کے مناقب میں علامہ شامی نے مستقل رسالہ تالیف فرمایا جس کا نام "سل الحسام الھندی لنصرۃ مولانا خالد النقشبندی" تھا۔ یہ رسالہ مصر میں طبع ہو چکا ہے۔ اس میں اُن کا ۱۲۲۴ھ میں براہِ ایران پورے ایک سال کے سفر کے بعد دہلی پہنچنا۔ شاہ غلام علی کی خدمت میں پہنچ کر فیضیاب ہونا، قطب ارشاد بن کر واپس وطن جانا اور وہاں مرجعِ خاص و عام ہونا۔ ان سب باتوں کا مفصل ذکر ہے۔ اس رسالہ میں لکھا ہے کہ جس شام کو مولینا خالد کردی دہلی پہنچے تو آپ نے ایک زور دار قصیدہ لکھا جس میں آپ نے اپنے سفر کے حالات بیان کرتے ہوئے اپنے مرشد کی تعریف کی ہے۔ اس قصیدے کے پہلے اشعار یہ ہیں۔

کملَتْ مسافۃُ کعبۃِ الآمالِ ۔۔۔ حَمْدًا لِمَنْ قَدْ مَنَّ بِالْاِکمالِ

مَنْ نَوَّرَ الآفاقَ بعدَ ظلامِھَا ۔۔۔ وھَدیٰ جمیعَ الخلقِ بعدَ ضلالِ

اعنی غلامَ علی القرمَ الّذی ۔۔۔ من لحظہٖ یحیی العظامَ البالی

شیخ محسن نے اپنی کتاب "یانع جنی" میں اس قصیدہ کو پورے کا پورا نقل

کردیا ہے۔ شیخ مراد القزانی "رشحات" کے ذیل میں لکھتے ہیں۔ شیخ غلام علی ۱۱۵۸ھ میں بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ آپ دہلی میں مولانا مظہر جانجاناں کی خدمت میں پہنچے اور پورے پندرہ سال تک ان سے اخذ فیض کرتے رہے۔ بعد میں آپ اتنے مشہور ہوئے کہ دُور و نزدیک سے طالبانِ ہدایت آپ کے پاس پہنچتے تھے۔ چنانچہ آپ سے فیض پانیوالے زمین کے ہر حصّہ میں، شرق و غرب میں اور عرب و عجم میں پھیل گئے۔

شیخ خالد کردی کا نسب باپ کی طرف سے تو سیدنا عثمان سے ملتا ہے۔ اور آپ کی ماں ساداتِ علویہ میں سے تھیں۔ موصوف نے شیخ عبداللہ (غلام علی) سے نقشبندی مجددی طریقہ لیا۔ پھر بعد میں آپ شاہ عبدالعزیز کی مجلس میں بیٹھے جو اپنے زمانے کے ملک العلماء تھے۔ شیخ خالد کردی کے مرشد شیخ غلام علی نے ہی انھیں شاہ عبدالعزیز کے پاس جانیکا کہا تھا۔ شاہ صاحب نے شیخ موصوف کو اپنے علوم کی روایت کرنے کی اجازت دی۔ آپ کی وفات ۱۲۴۲ھ میں ہوئی۔

شاہ عبدالغنی محدث دہلوی نے شیخ خالد کا ایک فارسی قصیدہ نقل کیا ہے جس کے انسٹھ شعر ہیں۔ مطلع اور زمین ملاحظہ ہو ۔

خبر از من دہید آں شاہ خوباں را بہ پنہانی ۔۔۔ کہ عالم زندہ شد بارِ دگر از ابر نیسانی

شیخ کی مدح میں کہتے ہیں۔

امامِ اولیا سیاحِ بیدائے خدا بینی ۔۔۔ ندیم کبریا سبّاحِ دریائے خدادانی
مہینِ راہنمایاں شمع جمع اولیائے دیں ۔۔۔ دلیل پیشوایاں قبلۂ اعیانِ روحانی
چراغ آفرینش مہر برجِ دانش و بینش ۔۔۔ کلید گنج حکمت محرمِ اسرار سبحانی

ایمن قدس عبداللہ شہ کز التفاف اُو دہد سنگ سیاہ خاصیت لعل بدخشانی

مقطع

زجامِ فیض خودکن خالد درماندہ راسیراب کہ اولب تشنہ مستسقی و تو دریائے احسانی

اسی قصیدہ کا وہ شعر ہے جو متن میں درج ہے ؎

بدہلی ظلمتِ کفر است. گفتند و بدل گفتم بظلمت رو اگر در جستجوئے آب حیوانی

حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی مہاجر مدنی اپنے رسالہ "تذکرۂ حضرت شاہ غلام علی" میں لکھتے ہیں: "مولینا خالد شہر زوری کردی نے علمار ہند میں سے حضرت شاہ عبدالعزیز کی مدح کی"۔ ش، م صفحہ ۱۴۸ محمد نور الحق

میں نے (مولینا) مکہ معظمہ میں خالد کردی کے مطبوعہ مکاتیب دیکھے۔ سال بھر میں ایک بار وہ دہلی ایک خط لکھا کرتے تھے اور حجاج کی معرفت خط پہنچانے کا انتظام تھا۔ خط میں مولینا محمد اسماعیل شہید کا تذکرہ اس طرح کرتے، جیسے کوئی کسی کا دل سوز دوست ہو۔ ساتھ ہی شیخ خالد مولینا شہید کے علمی ترفع کے بھی بہت زیادہ معترف ہیں۔ ان خطوط میں "حضرات ثلاثہ" کی اصلاح خاص طور پر برتی جاتی ہے: "حضرات ثلاثہ کا لفظ اہل دہلی کی زبان میں امام عبدالعزیز اور ان کے دو بھائیوں مولینا رفیع الدین اور مولینا عبدالقادر کے لئے بولا جاتا تھا۔

۲۵۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب

شیخ محمد بن عبدالوہاب ابن سلیمان ہیں۔ شیخ موصوف ۱۱۱۵ھ میں نجد کی بستی عیینیہ میں پیدا ہوئے اور آپ ہی کی طرف وہابی جماعت منسوب کی جاتی ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نے جب دعوت و تبلیغ شروع کی تو موصوف وعیبہ تشریف لے گئے، اور وہاں کے امیر محمد بن سعود نے آپ کی اطاعت کرلی۔ یہ واقعہ ۱۱۵۹ھ کا ہے۔ اس کے بعد وہابی تحریک کو بڑا فروغ ہوا۔ اور نجد اور عمان تک اس کا اثر پھیل گیا۔ ۱۲۰۰ھ میں حجاز اور یمن پر بھی وہابیوں کی عملداری ہوگئی۔ امام شوکانی کے شاگرد محمد بن ناصر حازمی لکھتے ہیں۔ "شیخ محمد بن عبدالوہاب صاحب علم بزرگ تھے۔ آپ کا طبعاً دینی قیادت کی طرف رجحان تھا۔ موصوف کے رسالے مشہور خاص و عام ہیں۔ ان میں سے بعض تو قابلِ قبول ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو ردّ کئے جاتے ہیں۔ شیخ موصوف کی دو باتیں ہیں، جو پسند نہیں کی جاتیں۔ ایک تو یہ ہے کہ انھوں نے چند بے اساس امور کی بنا پر تمام دنیا کو کافر قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ داؤد بن سلیمان نے شیخ موصوف کے اس دعوے کا نہایت مناسب ردّ لکھا ہے۔ اور ان کی دوسری زیادتی یہ تھی کہ بلا کسی دلیل و حجت کے انہوں نے بے گناہوں کو قتل کرنے کی اجازت دی۔ چنانچہ شیخ موصوف یہ اعلان کیا کرتے تھے کہ جس نے اللہ کے سوا کسی اور سے دعا کی۔ یا کسی نبی، بادشاہ اور عالم کو اس میں وسیلہ بنایا تو وہ مشرک ہے۔ خواہ وہ دل سے چاہے یا اس کا انکار کرے۔ اور وہ اس کا عقیدہ رکھتا ہو، یا اس کو نہ مانتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے روئے زمین کے سب مسلمانوں کو تکفیر کا نشانہ بنا دیا۔ چنانچہ جو مسلمان اولیا سے دعا کرتے ہیں۔ ان کو موصوف نے کافر قرار دیا۔ اور جو ان کے کفر میں شک کرے۔ شیخ موصوف نے ان شک کرنے والوں کو بھی کافر ثابت کیا۔ آپ اُن لوگوں سے جو آپ کے مخالف تھے۔

جہاد کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اور جس طرح بھی بس چلے، ان کو قتل کرنا روا جانتے تھے اور ان کے مال و دولت کو لوٹنے کی اجازت دیتے تھے۔ موصوف نے اس طرح دنیا جہاں کے مسلمانوں کو زمرۂ کفار میں داخل کر دیا۔ گو شیخ نے شریعت کے ایک حصہ کو جانا تو ضرور، لیکن آپ نے اس میں امعانِ نظر سے کام نہ لیا۔ دراصل موصوف نے کسی ایسے استاد سے علم حاصل نہ کیا تھا جو انھیں صحیح ہدایت کی راہ پر لگاتا اور نفع مند علوم کی طرف اُن کی رہنمائی کرتا، اور دین کے معاملات میں ان میں تفقہ اور سمجھ پیدا کرتا۔ طلبِ علم کے سلسلہ میں موصوف نے صرف اتنا کیا کہ شیخ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن قیم کی بعض کتابیں پڑھ لیں اور ان کی تقلید کی۔ دراں حالانکہ یہ دونوں بزرگ تقلید کو جائز نہ سمجھتے تھے۔

شیخ سید محمد امین جو ابنِ عابدین کے نام سے مشہور ہیں، شرح الرد المختار میں باغیوں کے ذکر میں لکھتے ہیں: "ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں محمد بن عبدالوہاب کے ماننے والے ہیں، ابھی پچھلے دنوں یہ لوگ نجد سے نکلے اور حرمین پر قابض ہو گئے۔ یہ اپنے آپ کو حنبلی مذہب کے پیرو کہتے ہیں۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ اپنے سوا باقی سب مسلمانوں کو جو ان کے اعتقادات کے مخالف ہوں کافر سمجھتے ہیں، اور ان کا خون بہانا جائز جانتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اہل سنت اور ان کے علماء کو قتل کرنے میں دریغ نہ کیا۔ ۱۲۳۳ھ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی طاقت کو توڑا اور ان پر مسلمانوں کے لشکر کو فتح دی۔"

محرم کی آٹھویں تاریخ ۱۲۱۸ھ میں ہفتہ کے روز دن ڈھاڑے انھوں نے حرم محترم پر حملہ کیا تھا۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب اس سے پہلے ۱۲۰۶ھ میں

انتقال کر چکے تھے۔ یہ حملہ شیخ موصوف کے صاحبزادے عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب کے عہد میں ہوا۔ ابجد العلوم صفحہ ۸۷۱

۲۶ طریقہ امام ولی اللہ دہلوی و طریقہ محمد بن عبدالوہاب النجدی

"امام ولی اللہ دہلوی کا مسلک یہ ہے کہ وہ زیر بحث مسائل کو اوّل تو کتاب اور سنت کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اور پھر ان کے متعلق فقہاء کے جو اقوال اور آراء ہیں ان کو کتاب اور سنت کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ جو فقہی اقوال ان دونوں پر پورے اُتریں انہیں تو قبول کر لیتے ہیں اور جو ان کے خلاف نظر آئیں انھیں رد کر دیتے ہیں۔ اور اس معاملہ میں وہ کسی شخصیت کی پروا نہیں کرتے۔ یہی کیفیت ان کے پوتے مولٰینا محمد اسماعیل شہید کی ہے۔ موصوف نے اپنے جدِ امجد کے اسی طریقہ کی پیروی کی۔ اور خدانخواستہ جیسا کہ جاہل سمجھتے ہیں، آپ نے اسلام میں کوئی نئی بات اپنی طرف سے جاری نہیں کی۔ شاہ اسماعیل شہید کا یہ طریقہ حنفی فقہ کے خلاف نہ تھا اور یہی وہ شاہراہِ شریعت ہے۔ جس پر اسلاف اور ان کے بعد آنے والے چلتے رہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سی مُردہ سنتوں کو زندہ کیا۔ اور بہت سے شرکوں اور بدعتوں کو مٹایا۔ اور خدا نے انھیں شہادت فی سبیل اللہ کا درجہ عطا فرمایا۔ لیکن خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں نے مرحوم کے معاملہ میں بیجا تعصب برتا۔ اور ان کے ساتھیوں اور ان کے پیروؤں سے ناروا طور پر دشمنی کی۔ چنانچہ ان کے طریقہ کو شیخ محمد بن عبدالوہاب سے منسوب کر دیا۔ اور انھیں وہ وہابی کہنے لگے۔ حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے یہ بزرگ نہ

نجد کو جاتے تھے اور نہ صاحب نجد کو یہ گھرانا حنفی فقہ کا متبع اور پاک نفوس کا حامل تھا۔" از حطۃ" مولفہ نواب صدیق حسن خاں۔

مولانا شہید نے اپنی کتاب تقویۃ الایمان میں "توسل فی الدعاء" کو جائز اور شرک اصغر کے مرتکب کو کافر نہ مانتے ہوئے غیر مغفور قرار دیا ہے، یہ دو اساسی مسئلے ہیں جو محمد بن عبدالوہاب کی کتاب التوحید کے مناقض ہیں۔

"توسل فی الدعاء" سے مراد یہ ہے۔ مثلاً خدا تعالےٰ سے استدعا کی جائے بحرمت فلاں یا بحق فلاں کہہ کر۔ تو اس توسل کو ابن عبدالوہاب نہایت شدت سے ممنوع قرار دیتے ہیں۔ مولانا محمد اسماعیل کے ہاں یہ توسل ناجائز نہیں ہے۔ تقویۃ الایمان میں وہ اس کے جواز کی تصریح کرتے ہیں۔ لیکن "یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ" جہاں ذات الٰہی کو توسل کے درجہ پر لایا گیا ہے ہر دو کے ہاں ناجائز ہے۔ یہ ہے توسل فی الدعاء کا مسئلہ جس میں ہر دو طرف ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔

شرک اصغر کا مسئلہ حسب ذیل ہے۔ آیت ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء کی تفسیر میں ہر دو کا اختلاف ہے۔ اس آیت کا ظاہری اقتضا یہی ہے کہ شرک غیر مغفور ہے۔ اور ماورا شرک دوسرے کبائر قابل مغفرت ہیں، یہ اس آیت کا ظاہری تقاضا ہے۔ اب شرک کا لفظ دو درجوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ شرک اکبر، شرک اصغر۔ شرک اکبر تو یقیناً کفر ہے کسی شخص کا اہل اسلام میں سے اس میں اختلاف نہیں بیشک وہ غیر مغفور اور ابدی عذاب کا باعث ہے۔ شرک اصغر کو اہل علم کبائر میں شمار نہیں کرتے۔ محمد ابن عبدالوہاب اس کو شرک اکبر سے ملاتے ہیں۔ چونکہ نص میں عموم ہے۔ اس لئے

وہ اس میں تخصیص کی اجازت نہیں دیتے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو مسلمان شرک اصغر میں مبتلا ہو، اس کا اسلام ان کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ مثلاً مسئلہ یا فسخ اور من احلف بغیر اللہ فقد اشرک، وغیرہ امور یہاں عام اہل علم اور ابن عبدالوہاب کا اختلاف واضح ہوگیا۔

مولانا شہید یہاں حَکَم کے طور پر ایک فیصلہ کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں شرک اصغر کی بھی جس قدر سزا مقرر ہے وہ مغفور نہیں ہوگی۔ شرک اصغر کبائر میں شامل نہیں۔ اس کی سزا اس کے مرتکب کو ضروری طور پر بھگتنا پڑے گی۔ مگر وہ کفر کے برابر نہیں کہ ابدیتِ عذاب اس میں ثابت ہو۔ ابن عبدالوہاب آیت مذکورہ میں شرک کی تخصیص سے مانع تھے۔ ہم نے بھی اس کی تخصیص نہیں کی۔ بلکہ اس کا عموم برحال رکھا۔ اور عموم بحال رکھ کر حُکم میں جو اہل علم کا متفقہ مسئلہ ہے (صحابہ اور تابعین کے عہد سے لے کر) کہ شرک اکبر و اصغر میں فرق ہے۔ اس کو قائم رکھا۔ مولانا محمد اسمٰعیل اس تحقیق میں منفرد ہیں۔ مسلمانوں میں ہم نے اب تک کسی عالم کے کلام میں اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں دیکھا۔ اور "تقویۃ الایمان" میں ان اللہ لا یغفران یشرک بہ الخ کے متعلق جو فائدہ لکھا۔ اس میں اس کی تصریح کردی۔ ہم نے نجدی علماء کو لطافت سے اس پر متنبہ کیا۔ کہ وہ سُن کر حیران رہ گئے۔ پھر کبھی انہوں نے اس پر بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ اس سے ان کے امام کی ساری اساس منہدم ہو جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ مولانا شہید کی بات کا انکار بھی نہیں کرسکتے۔ ہمارے سامنے انہوں نے اس بات پر کوئی انکار نہ کیا۔ اور مولانا شہید کی عظمت کا اعتراف کرلیا۔

ان حالات کے بعد ہم کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہر دو تحریکیں ایک ہیں ہندوستان سے بعض اہل حدیث مکہ معظمہ آتے رہے۔ اور نجدیوں کو یقین دلاتے رہے کہ مولانا اسمٰعیل شہید تمہارے ہم مسلک ہیں۔ ہم نے جب ان کو مابہ الفرق سمجھایا۔ تو وہ حیران رہ گئے کہ یہ اہل حدیث کیسے ہیں۔ کہ اپنے امام کی باتوں کو بھی نہیں سمجھتے۔ ہم نے کہا یہ اور زیادہ تعجب انگیز ہے کہ وہ کتاب سلیس اردو میں لکھی ہوئی ہے۔

۲۷۔ امام شوکانی۔

محمد بن علی بن محمد شوکانی ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۷۲ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ نے تمام علوم اور ان کی جملہ اجناس، انواع اور اصناف میں تبحر حاصل کیا۔ آپ کو محققین شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ نصیب ہوا۔ نیز آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن کی تعداد ۶۵ تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے "نیل الاوطار" نام کی کتاب ایسی ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔ اس میں موصوف نے ہر مسئلہ کی دادِ تحقیق دی ہے۔ اور کہیں انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ آپ نے دوران بحث میں اپنے آپ کو اسلاف کے مذہب کا سرتاپا مقید نہیں رکھا۔ امام شوکانی کہا کرتے تھے کہ مجھے اپنی تمام تصنیفات میں یہ کتاب سب سے زیادہ پسند ہے۔ اور یہی میرے بلند پایہ اسلوب تحریر کا نمونہ ہے۔ موصوف کے شاگردوں نے بارہا اس کتاب کو آپ سے پڑھا۔ اور اہل علم نے اس سے استفادہ کیا۔ امام شوکانی نے یہ کتاب اپنے اساتذہ کی زندگی میں لکھی تھی چنانچہ اس میں جو سقم رہ گئے تھے۔ اساتذہ نے ان کی طرف توجہ دلائی۔ اور ان کی اصلاح کر دی گئی۔ شوکان ایک شہر کا نام ہے۔ امام شوکانی کا انتقال

سنہ ۱۲۵۰ھ جمادی الآخرۃ میں ہوا۔ ابجد العلوم صفحہ ۸۷۷

کتاب "التمہید" میں ہے (مولٰینا فرماتے ہیں) میں نے امام محمد بن علی شوکانی کی فقہ امام حسین بن محسن یمنی سے حاصل کی تھی اور موصوف نے محمد بن نصر حازمی اور احمد بن محمد بن علی شوکانی سے پڑھا تھا۔ اور یہ دونوں بزرگ امام شوکانی کے شاگرد تھے۔ میں ایک طویل عرصہ تک امام موصوف کی تصنیفات سے استفادہ کرتا رہا۔ اور مجھے اس کے اعتراف کرنے میں تامل نہیں ہے کہ ان کتابوں کی مدد سے اللہ تعالٰی نے میرے لئے ارباب تحقیق کے طریقہ کو سمجھنا آسان کردیا۔ لیکن امام شوکانی کے بہت سے اجتہادی مسائل ایسے ہیں، جن سے مجھے اتفاق نہیں۔ بہر حال میں یہ مانتا ہوں کہ وہ منصف مزاج عالم دین ہیں۔ اصول و فروع میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں۔ مذہباً زیدی ہیں۔ اور سنت کی ترویج و اشاعت میں کوشاں ہیں۔ لیکن اہل سنت کے فقہا اور نیز اہل ظاہر کے ساتھ بہت سی باتوں میں اتفاق نہیں کرتے۔ چنانچہ جو شخص امام ولی اللہ اور ان کے پیروؤں کے طریقہ سے واقف ہے وہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ ولی اللہی طریقہ کے اہم اور واضح اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اصول ہو یا فروع، ہر دو میں نہ شیعوں کے امامیہ فرقہ سے متفق ہیں، اور نہ زیدیوں سے۔ ہم اس امر کی وضاحت کے لئے امام شوکانی کے مسلک اور ولی اللہی طریقہ سے ایک ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

امام شوکانی اپنی کتاب "ارشاد الفحول" میں لکھتے ہیں۔ اجماع کے مسئلہ میں علماء میں اختلاف ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اجماع کا ہونا فی نفسہ ممکن ہے،

یا اگر اجماع ہو بھی تو اس کے علم کا کہاں تک امکان ہو سکتا ہے، اور پھر اجماع کی روایت ممکن ہے یا نہیں۔ نیز کیا اجماع شرعی حجّت کی حیثیت رکھتا ہے؟ جمہور کا تو یہ خیال ہے کہ اجماع شرعی حجت ہے۔ لیکن نظام شیعوں کا امامیہ فرقہ اور بعض خوارج اسے شرعی حجت نہیں مانتے۔ اور ظاہر ہے کہ اجماع شرعی حجت تو اس وقت ہی ہو سکتا ہے۔ جب خود ہماری نظروں کے سامنے اجماع ہو۔ لیکن جب وہ ہمارے سامنے عملی شکل میں نہیں آتا تو وہ کس طرح شرعی حجّت بن سکتا ہے۔ اس کے بعد امام شوکانی اجماع کو شرعی حجت ماننے والوں کے دلائل بیان کرتے ہیں، اور ان کا جواب بھی دیتے ہیں، اور آخر میں وہ اس بحث کو یوں ختم کرتے ہیں "خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم ان امور پر غور کرو۔ اور اصل حقیقت کو جاننے کی کوشش کرو۔ تو تم پر حق بات صاف صاف آشکارا ہو جائے گی اور اس میں کوئی شک و شبہ نہ رہے گا۔ اور فرض کیا اگر ہم اجماع کو شرعی حجّت ماننے والوں کا دعویٰ تسلیم بھی کر لیں۔ اور اجماع کے ممکن ہونے۔ اور اس کے علم کے حصول کے امکان کو مان لیں تو پھر بھی اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اجماع کا ہونا حق ہے۔ لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ وہ چیز جس پر اجماع ہوا فی نفسہٖ حق ہے، اور اس کا اتباع شرعی لحاظ سے واجب اور ضروری ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ہر مجتہد راہ صواب پر ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہوتے کہ دوسرے مجتہد کے لئے اس مجتہد کے اجتہاد پر عمل کرنا ضروری ہے۔ جب یہ بات تمہارے ذہن نشین ہو گئی تو تم آسانی سے جان لو گے کہ صحیح راہ کونسی ہے۔ اہل علم نے اجماع کے مسئلہ میں جو لکھا ہے

اب ہم اُسے ذکر کر دیتے ہیں تاکہ ہماری بات صاف ہو جائے"۔

اجماع کے مسئلہ پر مولینا اسماعیل شہید اپنی کتاب "اصول فقہ" میں لکھتے ہیں:۔ "اجماع سے احکام ثابت ہوتے ہیں۔ اجماع یا تو بسیط ہوتا ہے بسیط سے یہ مراد ہے کہ ایک امر پر اجماع کرنے والوں کا اتفاق ہو۔ یا اجماع مرکب ہوتا ہے۔ اور مرکب سے مطلب یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ باتوں پر اتفاق ہو۔ لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ ان دو یا دو سے زیادہ باتوں میں ایک نہ ایک چیز ضرور مشترک ہو۔ اور پھر اجماع یا تو حقیقی ہوتا ہے۔ حقیقی ان معنوں میں کہ سب کے سب اپنی زبانوں سے اتفاق رائے کا اظہار کریں۔ اور اگر کوئی خاموش بھی رہے تو یہ خاموشی رضامندی کے مرادف ہو۔ اور ایک اجماع حکمی ہے جو اجماعِ حقیقی کے خلاف ہوتا ہے۔ پھر ایک اجماع قوی ہے۔ قوی سے مراد یہ ہے کہ عہد ماضی اور زمانۂ حاضر کے سب مسلمانوں کو اجماع سے پورا اتفاق ہو۔ اور ایک متوسط اجماع ہے، جو اہل حق کے اتفاق سے عبارت ہے۔ اور یہ اجماع صرف صحابہ ہی کے زمانہ میں ممکن تھا۔ اور اس نوع کے اجماع کی تیسری قسم اجماع ضعیف ہے۔ اور وہ صحابہ کے بعد کا اجماع ہے۔ بہر حال" اجماع حقیقی بسیط خواہ وہ قوی ہو یا متوسط، قطعی درجہ رکھتا ہے۔ اور اس کی حیثیت اثبات اور تعارض کے اعتبار سے "مشہور حدیث" کی سی ہے۔ اور اس کے علاوہ جو اجماع ہے، وہ ظنی اور مشکوک ہے"۔

اب (مولینا فرماتے ہیں) اگر تم اس کلام کی تفصیل چاہو تو امام ولی اللہ کی کتابوں اور خاص طور پر "ازالۃ الخفا" کی طرف رجوع کرو۔ گو میرے پاس

امام شوکانی کے مسلک اور ولی اللہی طریقہ میں جو اور اساسی اختلافات ہیں، ان کی بہت سی اور مثالیں بھی موجود ہیں، لیکن یہاں میں نے صرف ایک ہی مثال پر اکتفا کیا ہے۔ اور یہ صحیح راہ عمل کے تعین میں اصولی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ احکام جو اجماعِ متوسط سے ثابت ہو چکے ہیں۔ ولی اللہی طریقہ کے نزدیک صحیح راہ عمل میں داخل ہیں۔ لیکن امام شوکانی ان کو شرعاً حجت نہیں مانتے

کتاب التمہید صفحہ ۶۱

اجماع کے شرعی حجت ہونے پر مدار ہے۔ صدیق اکبر کی خلافت کا۔ مصحفِ عثمان کے متبوع ہونے کا۔ ہم جدید اصطلاح میں اجماع کے عوض جمعیت مرکزیہ کا فیصلہ استعمال کرتے ہیں۔ آج جس چیز کو جمعیت مرکزیہ کا فیصلہ کہا جاتا ہے۔ اسی چیز کو اس زمانہ میں اجماع کہتے تھے۔ اس قسم کے فیصلوں کو حجت مانے بغیر کبھی کوئی سیاسی تحریک دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لہذا شیعہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر اہل سنت کا مدار ہی سراسر اسی پر ہے۔ الغرض ان ہر دو مسلکوں کا فرق غور کرنے والے پر زیادہ دیر تک مخفی نہیں رہ سکتا۔

۲۸۔ امام ربانی مجدد الف ثانی

امام ربانی کی دعوتِ تجدید کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لئے جلال الدین اکبر بادشاہ کے متعلق چند امور کا جاننا ضروری ہے۔ جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر ہندوستان سے فرار ہوا تو وہ سیدھا شاہ اسماعیل صفوی کے پاس ایران پہنچا۔ اور ایرانی حکومت سے باقاعدہ معاہدہ کرنے کے بعد اس کی مدد سے وہ کھوئے ہوئے تخت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ہمایوں

نے منظور کیا تھا۔ کہ میں شیعہ مذہب کو رائج کروں گا۔ اور شیعہ" ریجنٹ" بیرم خاں کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اکبر نے شیعیت کی بنیاد کاٹنے کے لئے ملکی حکومت کی طرح ڈالی۔ اب اس پر نہ تو کوئی سُنی خلیفہ دباؤ ڈال سکتا تھا۔ اور نہ کوئی شیعہ بادشاہ تحکم چلا سکتا تھا۔ اکبر جیسا انصاف پسند بادشاہ ہندوستان نے پیدا نہیں کیا اس کے نزدیک قانون کی نظر میں اس کا بیٹا اور دشمن مساوی تھے۔

ہم حرم محترم میں علماء، مشائخ، سلاطین ہر سہ کے لئے فرداً فرداً نام لے کر کلام الٰہی و اذکار وغیرہ کا ثواب ان کی روحوں کو بھیجتے تھے، مگر اکبر کو چھوڑ دیتے تھے۔ ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک چبوترہ ہے جو کافی بلند ہے۔ مگر ہے سادہ۔ اس پر اکبر تنِ تنہا کھڑا ہے۔ اور سامنے دار پر ایک شخص لٹک رہا ہے۔ اور ہم کھڑے دیکھ رہے ہیں ہم نے اسکی تعبیر یہ کی۔ کہ ہند میں انصاف کرنے والا فقط اکبر ہے۔ جس نے انصاف کی روح کو قائم رکھا۔ اور ہندو مسلم کو یکساں موقع دیا۔ کہ وہ انصاف سے متمتع ہوں۔ یہ کوئی قاعدہ نہیں کہ مسلمان انصاف سے متمتع ہوں۔ اور ہندو بوجہ ہندو ہونے کے رہ جائے۔ قال تعالیٰ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ الآیہ۔ دینِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ انصاف کی روح زندہ رہے اس کا مضاف الیہ خواہ کوئی ہو۔ اس بلند نشیمن پر فقط اکبر ہی بیٹھا ہے۔ اور دار انصاف کی دار ہے۔ جہانگیر نے سونے کی زنجیر کیوں بندھوائی؟ اس کو تو عیاش سمجھا جاتا ہے، وہ اکبر کا بیٹا تھا جو انصاف کو عام کرنے آیا تھا۔

جب اکبر نے ملکی حکومت پیدا کر لی۔ اور بیرونی اسلامی دنیا سے اس کا تعلق منقطع ہوگیا تو اب دو صورتیں تھیں۔ اول یہ کہ مختلف مذاہب کو غیر معتبر قرار

دے کر لادینیت پر ساری مملکت کو جمع کیا جائے جس کا تجربہ اب یورپ میں ہو رہا ہے۔ مگر اکبر نے یہ احتمال قریب بھی نہ پھٹکنے دیا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ مختلف مذاہب کو تسلیم کر کے ہر ایک کو پوری آزادی دی جائے، اور قانونِ حکومت کی جو شخص خلاف ورزی کرے۔ اس سے مواخذہ ہو۔ خواہ ہندو ہو یا مسلم، دوسرے لفظوں میں مذہب آزاد ہے، جب تک حکومت سے متصادم نہ ہو۔ یہ اکبر کا بنایا ہوا قانون ہے جس پر انگریز اب عمل کر رہے ہیں۔ اور اپنے آپ کو بڑا اعالی دماغ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس ملک میں جو مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے، حکومت چلانے کے لئے بادشاہ اور اس کی انتظامی کونسل کا کیا طرزِ عمل ہوگا؟ اس کے لئے اکبر نے دین الٰہی کا فقرہ ایجاد کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اور اس مرکزی کونسل کسی خاص مذہب کے طرفدار نہیں ہوں گے۔ مگر مطلق مذہب کی پابندی سے بھی اپنے آپ کو آزاد نہیں کریں گے اور لادینیت نہیں آنے پائے گی۔ یعنی خدا کی حکومت اپنے اوپر تسلیم کرینگے۔ ایک ہندو اللہ کی حکومت کی تفسیر ایک طرح کرتا ہے۔ اور ایک سُنّی مسلمان دوسری طرح۔ اور ایک شیعہ تیسری طرح۔ ان اختلافات سے حکومت کو تعرض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔ البتہ پرائیویٹ طور پر بادشاہ اور ارکان کونسل اپنے اپنے مذہب کے پابند رہیں گے۔ اس یکسانی کو دین الٰہی سے تعبیر کیا گیا۔

اس وسیع مملکت کے لئے اس سے بہتر غیر اسلامی نظام ناممکن تھا۔

ہماری رائے میں جو کام اکبر نے شروع کیا وہ اساساً صحیح تھا۔ اور عملاً غلطیاں اس لئے ہوئیں کہ اس عظیم الشان کام کو چلانے کے لئے آدمی میسر نہیں

آتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ ضرورتیں خدا تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ کے ذریعے پوری کردیں۔ شاہ صاحب نے اس کام کو مکمل کردیا جو اکبر نے شروع کیا تھا کیونکہ وہ بھی اسلام کو انسانیت کی تفسیر بناتے ہیں، اور آپ تمام ادیان کو منطبق کرسکتے ہیں۔ ان کے طریقے پر ایک مسلم عالم اس نظام سلطنت کو چلا سکتا ہے جو اکبر کا مقصد تھا۔ اگر ہندوستانی دماغ شاہ صاحب کے طریقے کا عالم بننے کے بعد نظام سلطنت چلانے کا ارادہ کرے تو اس کے مقابلے میں کوئی اجنبی حکومت کامیاب نہیں ہوسکتی، خواہ وہ کافر ہو یا مسلم۔ شاہ صاحب کی حکمت پڑھنے کے بعد اگر کوئی اسلامی ممالک کی سیر کرے تو اس کے سامنے یہ بات آجائے گی کہ وہ ملک اپنا فقہی مذہب چلانے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں۔ لیکن اگر مختلف مذاہب کو اپنے یہاں اجازت دیں یا اجازت دینے پر مجبور کردیئے جائیں۔ تو سوائے لادینیت کے اور کوئی نظامِ حکومت ان کے یہاں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ٹرکی میں جاکر دیکھ لو۔ پھر دیکھو کہ کس طرح عرب و افغانستان ٹرکی کا تتبع کررہے ہیں۔ اب اسلامی ممالک کی یہ حالت ہے کہ وہاں یا اکبر کا دین الٰہی ہے۔ یا لادینیت۔ اگر شاہ صاحب کی حکمت کا رواج ہوتا تو وہ ممالک اس مرض میں مبتلا نہ ہوتے۔

اکبر کے کارکن جو غلطیاں کرتے تھے۔ اور اسلامی حدود سے باہر نکلتے تھے ان کی اصلاح کا ابتدائی کام حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے شروع کیا اور وہ مجدد ما[illegible] ثانی نے جس کام شروع کیا تھا۔ اس کی تکمیل محمد شاہ کے عہد میں شاہ ولی اللہ نے کی۔ شاہ صاحب کو کام کرنے کا

اس وقت موقع ملا۔ جب دلی کی سلطنت اصلی معنوں میں مسلمانوں کے ہاتھ سے جا چکی تھی۔ اس لئے اس تعلیم کے نتائج اسوقت پھیل نہ سکے۔

الغرض اکبر کے کارکنوں کی بعض غلطیوں کی اصلاح کے سلسلہ میں امام ربانی نے جو کام شروع کیا تھا۔ امام ولی اللہ نے اُسے مکمل کر دیا۔ چنانچہ امام ربانی کو شاہ صاحب اپنے طریقے کا "ارہاص" مانتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ سے استبعاداً ذکر کیا کہ شاہ صاحب حضرت مجدد کو ارہاص کہتے ہیں۔ تو حضرت نے فرمایا یہ بہت بڑی بات ہے۔ یعنی حضرت مجدد بہت بڑی ہستی ہیں۔ اس لئے شاہ صاحب کا یہ لکھنا خود شاہ صاحب کے حق میں یعنی ان کی عظمت ثابت کرنے کے لئے بہت بڑی چیز ہے۔ حضرت کا جواب میرے اس وہم کو دور کرنے کے لئے تھا کہ شاہ صاحب نے مجدد صاحب کو ارہاص کہہ کر میرے نزدیک خلاف معمول بات فرمائی تھی۔

حضرت شاہ صاحب مکتوبات میں فرماتے ہیں "خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام پر ایک ہزار برس گزرنے کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں بعض اعتبارات سے پہلے فیوض مثلاً قلب و روح اور ان کے سر کے احوال اجمالی صورت میں ظاہر ہوئے۔ اور بعض اعتبارات سے پہلے فیوض مفصّل طور پر رُونما ہوئے۔ مثلاً اس دور میں "حجر بحت" اور "انانیت کبریٰ" کے مسائل پہلے دوروں کے مقابلہ میں بڑی تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں۔ الغرض اس دور کے ارہاص شیخ مجدد ہیں۔ اس دور کے بہت سے مخصوص معارف شیخ موصوف نے رمز و ایما میں بیان فرمائے۔ وہ اس دور کے قطب ارشاد

ہیں۔ اور اُن کے مبارک ہاتھوں سے بہت سی گمراہیاں اور بدعتیں دور ہوئیں، فقیر شیخ مجدد کے بہت سے معارف کا جو موصوف اس دورہ کے فاتح کی حیثیت سے فرما چکے ہیں، مصداق ہے۔" صفحہ ۹۰

غرضیکہ امام ربانی شاہ ولی اللہ کے طریقہ کے ارہاص ہیں۔ اور اسی روشنی میں ہم آپ کے اس ارشاد کو حل کرتے ہیں " مجھے ایک عظیم کارخانہ حوالے کیا گیا۔ اور مجھے پیری و مریدی کے لئے نہیں متعین کیا گیا۔ میری تخلیق کا مقصد خلقت کی محض تکمیل و ارشاد نہیں۔ بلکہ کوئی اور معاملہ مقصود ہے۔ اور کوئی دوسرا کارخانہ مطلوب "۔ مکتوب ششم دفتر دوم۔ فسانہ طرازوں اور قصہ گو حضرات نے ان تصریحات کو دوسرے ادنیٰ محامل پر محمول کر لیا ع

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

مذکورہ بالا عبارت صاف طور پر اس امر کی صراحت کرتی ہے کہ امام ربانی اس دور کے ارہاص ہیں۔ تفہیمات الہیہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اس دور کے "قیم" امام ولی اللہ ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے " ہم سے پہلے جو بزرگ گزرے ہیں وہ وحدت الوجود کے سراغ میں بہت آگے بڑھ گئے اور آخر ان کا علم اس منزل پر پہنچا کہ سب کچھ اللہ ہی اللہ ہے۔ اس پر ملأ اعلیٰ میں وجود حقیقی اور مخلوقات میں جو اتحاد اور اختلاف ہے۔ اس کا علم متشکل ہوا۔ شیخ مجدد آئے اور اس علم کے اردگرد جو ملاء اعلےٰ میں مقدر ہو چکا تھا گھومتے رہے۔ کبھی تو انہوں نے یہ فرمایا کہ عالم موجود فی الخارج ہے۔ اور کبھی یہ فرمایا کہ عالم موہوم ہے۔ اور کبھی ارشاد کیا کہ عالم اسمائے الٰہی کا پرتو ہے لیکن اس مسئلہ کی انہوں

نے صراحت نہ فرمائی۔ آخرکار اس دورہ کا قیم آیا۔ اور اس نے جو حقیقت تھی وہ کھول کر بیان کر دی۔ ص ۱۰۱ و ص ۱۰۲

شاہ ولی اللہ نے امام ربانی کے بعض بیانات کی جن کے اغلاق کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں اس طرح وضاحت بھی کی کہ امام ربانی کا حقیقی مقصود وا انکشاف ہوگیا امام ربانی کے بعض اقوال پر عرب و ہندوستان میں بڑے اعتراض ہوئے تھے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلم کو "درجۂ خلت" میرے ذریعہ نصیب ہوا۔ شاہ ولی اللہ اس کی توجیہ فرماتے ہیں کہ یہ بیان کی پیچیدگی اور الفاظ کی کوتاہی اور عدم مساعدت ہے۔ ورنہ ان کا مطلب صحیح ہے۔ اور اس میں کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان کو فتح کیا۔ اور یہاں اسلامی سلطنت قائم کی۔ گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا ممالک اور ادیان پر غلبہ آپ کے ذاتی کمالات میں داخل ہے۔ مگر ہندوستان پر غلبہ متحقق ہونے میں سلطان محمود واسطہ بنتے ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض کمالات کی تشریح میں امام ربانی واسطہ بنے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ امام ربانی کے بیانات میں الفاظ کی ایک گونہ تنگی ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو مکتوبات صفحہ ۹۰

۲۹ سید احمد شہید کی تعلیم و تربیت۔

امام عبدالعزیز کے خواص اصحاب جن کے رگ و ریشہ میں حزب ولی اللہ کی خصوصیات سرایت کر چکی تھیں اور ایک لمبے زمانے سے ان کی تربیت

پر توجہ مرکوز رہی تھی۔ یہ شاہ عبدالعزیز کے تین بھائیوں کے علاوہ شاہ اسمٰعیل مولینا عبدالحی، مولینا محمد اسحاق اور مولینا محمد یعقوب تھے۔ امیر شہید دراصل اس حزب میں سے نہیں تھے، بلکہ بعد میں اس کے ساتھ منضم کئے گئے تھے۔ ان میں کشفی کمالات تھے سپاہ گری کی تعلیم تھی۔ سید تھے۔ اس لئے ان کو امام عبدالعزیز نے امارت جہاد کے لئے موزوں قرار دیا۔ مگر اس خیال سے کہ کہیں حزب مذکورہ کی راہ سے ہٹ نہ جائیں، ان کے ساتھ دو وزیر اپنے مکمل تربیت یافتہ لگا دیئے۔ مگر اپنا صحیح اور پورے معنوں میں جانشین حضرت شاہ اسحاق کو مقرر کیا۔

سید صاحب کی تعلیم کے متعلق کہتے ہیں کہ جب وہ کتاب دیکھتے تھے تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ غرض کتاب وسنت سے زائد چیز کے دیکھنے سے ان کی بصارت روک دی گئی تھی۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ شاہ ولی اللہ کے طریقے کا صاحب کشف اس سے زیادہ علوم کا محتاج نہیں ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ سید صاحب دینی علوم جس قدر ایک امیر کے لئے ضروری ہیں۔ ان کی تحصیل کر چکے تھے۔ ان کی کشف سے نئی دینی تعلیم ثابت نہیں ہو گی۔ اب یہاں سید صاحب کو اُمّی ثابت کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ یہ محض غلط ہے کہ شاہ اسحاق صاحب کے اشارے سے مولانا عبدالحی ان سے ملے اور بیعت کی۔ اس کے بعد مولانا عبدالحی کے کہنے پر مولانا اسمٰعیل نے بھی بیعت کر لی۔

بات یہ ہے کہ پڑھنے سے امیر شہید کی طبیعت پر بوجھ پڑتا تھا۔ اور کشف

طبعی پر یہ چیز گراں گذرتی تھی اس لئے ان کو سماع کے لئے حکم دیا گیا۔ تو اس طرح جس قدر شرعی علوم کی ضرورت تھی۔ انھوں نے حاصل کر لئے۔ گو وہ تحصیل علمائے طریقہ پر نہ تھی۔ ہم اس کا تجربہ سندھ کے اپنے دوسرے مشائخ میں رکھتے ہیں۔ وہ عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ قرآن شریف کا ترجمہ اور حدیث کی کتابیں سنتے۔ اور جو عالم انھیں سناتا۔ وہ اُن سے بدرجہا زیادہ علم رکھتا تھا۔ مگر جس وقت ان کو ایک شرعی مسئلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تحقیق ہو جاتا تو جس طرح وہ اپنی جماعت میں انقلاب پیدا کر دیتے تھے اس کا عشر عشیر بھی وہ عالم پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح پر ہم سید صاحب کو ایک عالم مانتے ہیں۔ اُن کے مناقب لکھنے والے دھوکہ دیتے ہیں۔ کہ وہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ بلکہ سب چیزیں کشف سے ان کو حاصل تھیں۔

ان کی خواہش دراصل یہ ہے۔ کہ سید صاحب کا جو تعلق تلمذ شاہ عبدالعزیز سے ہے وہ کاٹ دیا جائے۔ اور وہ ایک امام مہدی کے طور پر مانے جائیں۔ ان لوگوں نے اس تحریک کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

شاہ علم اللہ جن کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔ ان کے فرزند سید محمد ضیاء ان کے بیٹے سید شاہ ابو سعید ہیں۔ آپ امیر شہید کے جد مادری، اور امام ولی اللہ کے خلیفہ ہیں۔ سیرت احمدیہ صفحہ ۵۶ میں ہے اس خاندان کے بہت سے بزرگوں نے شاہ ولی اللہ اور آپ کے صاحبزادوں سے ظاہری اور باطنی استفادہ کیا۔ شاہ ابو سعید۔ شاہ محمد واضح۔ سید محمد معین۔ سید محمد لقمان۔ عم امیر شہید نے شاہ ولی اللہ سے۔ اور سید قطب الہدیٰ۔ سید محمد اسحٰق برادر اکبر امیر شہید

نے شاہ عبدالعزیز سے اور شاہ عبدالقادر سے استفادہ کیا۔ اس طرح اس خاندان میں حضرت مجدد سرہندی اور مجدد دہلوی کی برکتیں جمع ہوگئیں۔ یہ خاندان اپنا خصوصی مشرب اور مخصوص فکر رکھتا ہے۔ یہ خصوصیت امیر شہید کے خاندان میں حضرت مجدد کے خلیفہ شیخ آدم بنوری سے متوارث چلی آتی ہے۔ بنابریں سید امیر شہید کا حزب ولی اللہ کے رنگ میں پورے طور سے رنگا جانا بعید ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جب انھیں موقعہ ملا۔ تو انھوں نے اپنے امیر المومنین ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور تحریک ناکام رہ گئی۔

مشرقی۔ مغربی ہند کی رقابت تاریخ میں قدیم سے چلی آتی ہے۔ چندر بنسی سورج بنسی خاندان اسی مغربیت و مشرقیت کے دوسرے عنوان ہیں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ رقابت مذکورہ بعد از اسلام بھی قائم رہی۔ اور امیر شہید کے وقت بھی وہ بروئے کار آئی۔ امیر شہید مشرقی ہند رائے بریلی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے عامہ مریدین بھی بہار وغیرہ کے تھے۔ اس کے بالمقابل مغرب یعنی دہلی ہے۔ یہ لوگ دہلوی تحریک کو اپنانا چاہتے تھے۔ اسی لئے مولینا ولایت علی بہاری نے مولینا اسحاق کے خلاف دوسری جماعت تیار کی۔ وہ مولینا اسحاق اور حزب دہلوی کو اس میدان سے دور ہٹانا چاہتے تھے۔

۳۰۔ ہیئت اجتماعیہ کے مدارج

ایک شخص اپنے طبعی جذبات اور علوم کے متعلق ضروریات اور جسمانی حاجتیں تنہا کبھی پوری نہیں کر سکتا۔ جس جماعت میں یہ صلاحیت ہو کہ اس کا ہر فرد اپنی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ اس کو ہیئت اجتماعیہ کہا

جاتا ہے۔ یہ انسانی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ اس ہیئت اجتماعیہ کو قائم رکھنے کے لئے یہی لوگ اپنی حکومت بنا لیتے ہیں۔ حکومت بن جانے کے بعد افراد کی بغاوت ہیئت اجتماعیہ کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ اچھی حکومت پیدا کر لینا ہیئت اجتماعیہ کے بعد انسانیت کی ترقی کا دوسرا قدم ہے۔ جس جگہ یہ دونوں چیزیں مجتمع ہوں وہ مدینہ تامہ ہے۔ جہاں فقط ہیئت اجتماعیہ ہو۔ اور منظم حکومت نہ ہو (حکمراں افراد سے تو کوئی ہیئت اجتماعیہ خالی نہیں ہوتی۔ مگر اگر ان افراد کا ایک ایسا نظام جس کی وجہ سے ان میں ایک وحدت پیدا ہو۔ اور اُسے حکومت کہا جائے۔ یہ ہر ہیئت اجتماعیہ کے لئے لازم نہیں ہے) اس کو مدینہ ناقصہ کہتے ہیں۔ اور آج کل کی اصطلاح میں سوسائٹی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انارکسٹ سوسائٹی کو مانتے ہیں۔ اور اسی پر انسانی ترقی کو ختم کر دیتے ہیں۔ یہ سوسائٹی ہی اپنے اوپر خود حکومت کرتی ہے۔ مدن ناقصہ میں جو شاہ صاحب نے لکھا ہے، یہ مذکورہ بالا ہیئت اجتماعیہ کا ایک عنوان ہے۔ چھوٹے گاؤں میں تو ہیئت اجتماعیہ ہی حاکم ہوتی ہے۔ جیسے ایک بڑے گھر میں ہیئت اجتماعیہ حاکم ہے اسی طرح بعض بڑے گاؤں ہوتے ہیں۔ جن میں کئی کئی آدمی نمبردار اور چوہدری ہیں۔ اصلی طریقے کے مطابق وہاں ایک چھوٹی سی حکومت ہونی چاہئے۔ مگر بعض اوقات حکومت کے بغیر بھی وہ لوگ اپنے توافق سے کام چلا لیتے ہیں۔ پرانے راجپوتوں اور آج کے افغانوں میں پنچایت اور جرگے کی رسم اسی توافق کی مثالیں ہیں۔

بعض بڑے شہر ہیں۔ جہاں حکومت کے بغیر کوئی کام چل ہی نہیں سکتا

تو ان کے عقلمند اور نمایاں شخصیتیں سب ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں۔ عموماً اس اجتماع کا محل کوئی مقدس مقام ہوتا ہے۔ بحث کرنے کے بعد وہ ایک رائے قائم کر کے اٹھتے ہیں۔ یہ پارلیمنٹ ہے اور ہماری زبان میں اس کا نام اہل حل وعقد ہے۔ ہمارے متاخرین بادشاہوں نے اہل حل وعقد کی قوت کو برباد کر کے اپنی شخصیت کو نمایاں کیا۔ اور خود برباد ہو گئے۔ جب تک صالح بادشاہ رہے۔ جن میں بادشاہی چلانے کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ اہل حل وعقد کے مشوروں کے پابند رہتے تھے۔ ہمارے خیال میں یورپ نے پارلیمنٹ نظام کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی۔ مگر اس نظام کا طریقہ منضبط کر دیا۔ ہمارے یہاں یہ چیز منضبط نہیں ہے۔

دو آدمی مساوی درجے کے مل کر حکومت کرتے ہیں۔ جب وہ کسی مشورے میں مل بیٹھتے ہیں۔ تو جیسے سفر کے رفیق ایک شخص کو وقتی طور پر امیر بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح اس اجلاس میں ایک وقتی امیر بنا لیا جاتا ہے۔ اور اتفاق سے کام چلتا رہتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمیشہ بڑے شہروں اور ملکوں میں ملتی رہتی ہیں۔ یہ انسانیت کے طبعی تقاضوں میں سے ایک شق ہے۔ یعنی کبھی وہ ایسا بھی کر لیتے ہیں۔ جمعیۃ مرکزیہ میں عموماً بورڈ کی روح کام کرتی ہے۔ کیونکہ وہاں سب یکساں ہوتے ہیں۔ کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔

۳۱۔ سکھ

۱۷۶۲ء کے دوران میں سکھوں نے پنجاب میں بہت زیادہ اودھم مچایا۔ اور دہلی پر آفت لانے کا ارادہ کیا۔ مگر اس وقت پھر شاہ ابدالی نے نجیب الدولہ کی امداد کی۔ سکھوں نے سارے ملک میں غدر مچا رکھا تھا۔ اپریل ۱۷۶۷ء میں وہ

لاہور آیا۔ سکھ بھاگ کر پہاڑوں میں چلے گئے۔ آلا جاٹ نے سرہند میں دو لاکھ فوج جمع کر رکھی تھی۔ شاہ ابدالی نے نوے کوس دو روز میں طے کر کے اس پر حملہ کیا۔ اور شکست دی جس میں سکھوں کے بیس ہزار آدمی قتل ہوئے۔ اس کے بعد وہ کبھی ہندوستان نہیں آیا۔ تاریخ ذکار اللہ ص ۳۱۸

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے یہ اشعار (جو آپ نے اپنے چچا شاہ اہل اللہ کے نام لکھ کر روانہ کئے) سکھوں کے پیدا کردہ اضطراب کا صحیح نقشہ پیش کرتے ہیں۔

جزَی اللّٰہُ عَنَّا قومَ سکھ ومرھٹہ عُقُوبَۃَ شَرٍّ عَاجِلاً غَیْرَ اٰجِلِ
وَقَدْ قَتَلُوْا جَمْعًا کَثِیْرًا مِنَ الوریٰ وَقَدْ اَوْجَعُوْا فِیْ اَھْلِ شَاءٍ وجَامِلِ
لَھُمْ کُلَّ عَامٍ نَھْبَۃٌ فِیْ بِلَادِنَا یَخُوْضُوْنَ فِیْنَا بِالضُّحٰی وَالاَصَائِلِ
فَھَلْ ھٰھُنَا مِنْ مَعَاذٍ لِعَائِذٍ؟
وَھَلْ مِنْ مُغِیْثٍ یتَّقِی اللّٰہَ عَادِلِ

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

اَیَّامُ بَرْدٍ اَتَتْ فَالقَلْبُ مُنْجَذِعٌ مِنْ قَوْمِ سکھ وان الخوف معقولُ
اَنْفَاھُمُ اللّٰہُ عن ھٰذِہِ الدِّیَارِ فَھُمْ شَرُّ الاعادی وھُمْ مِنْ جِنَّۃٍ غُوْلُ
فَوَّضْتُ اَمْرِیْ وَامرالناسِ کلّھُمْ
اِلَی الاِلٰہِ وَاِنَّ الحِفظَ مَامُوْلُ

۳۲ ۔ مولینا محمد یعقوب دہلوی۔

آپ شاہ محمد اسحاق کے بھائی ہیں۔ آپ کا سن پیدائش ۱۲۰۰ھ ہے۔

امام ولی اللہ کو شاہ محمد اسحاق اور شاہ یعقوب کی ولادت اور حجاز کی طرف ہجرت کرنے کی بشارت دی گئی تھی۔ چنانچہ شیخ محمد عاشقؒ "قول جلی" میں لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے فرمایا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ سب کے سب فرزند جو لطف الٰہی سے مجھے عطا ہوئے ہیں، نیک بخت ہیں۔ اور ان میں پاک بازی اور نیکی ظہور پذیر ہوگی۔ لیکن تدبیر غیبی کا تقاضا یہ ہے کہ دو شخص اور پیدا ہوں گے جو مدتوں مکہ اور مدینہ میں دینی علوم کی ترویج کریں گے۔ اور وہیں سکونت پذیر ہو جائیں گے۔ یہ اپنی ماں کے رشتے سے مجھ سے متعلق ہوں گے۔ گو آدمی کو فطرتاً اپنے وطن مادری سے محبت ہوتی ہے۔ اور جہاں والدہ متوطن ہو۔ اُسے چھوڑنا بڑا گراں گذرتا ہے۔ لیکن بدرجہ مجبوری یہ بھی کرنا پڑتا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں "قول جلی" کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کی اس عبارت کے مصداق شاہ عبدالعزیز کے دونوں نواسے مولٰنا محمد اسحاق اور مولٰنا محمد یعقوب ہی ہو سکتے ہیں۔ ان دونوں نے دہلی سے ہجرت کی اور مکہ میں اقامت پذیر ہوئے۔ اور وہاں سالہا سال تک علم حدیث کا درس دیا۔ اور عرب و عجم اُن سے فیض یاب ہوئے۔

میرے (مولٰنا) نزدیک "احیائے علوم" سے مراد صرف حدیث کی روایت نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ یہ دونوں بزرگ آخر تک امر بالمعروف و نہی عن المنکر، دعوت جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ میں مصروف کار رہے اور یہی مقصد ہے احیائے علوم کا۔ شیخ محمد یعقوب نے اپنے نانا امام عبدالعزیز اور ان کے گرامی قدر ساتھیوں اور خاص طور پر شاہ محمد اسحاق سے علم حاصل

کیا تھا۔ آگے چل کر موصوف سے شیخ مظفر حسین کاندھلوی، امیر امداد اللہ، شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نے جو دیوبندی جماعت کے اساطین تھے، اکتساب علم کیا۔ شیخ محمد یعقوب کا انتقال ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ میں ہوا۔ اور مدرسہ دیوبند کی بنیاد ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ میں پڑی۔ اس دن سے حزب دہلوی کا نام دیوبندی جماعت مشہور ہوا۔ التمہید صفحہ ۲۱۵

امام عبدالعزیز کے انتقال کے بعد حزب دہلوی کی امارت مولانا محمد اسحاق کے سپرد ہوئی تھی۔ ۱۲۶۲ھ میں موصوف کا انتقال ہوا۔ تو مولانا محمد یعقوب دہلوی ان کے جانشین ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز سے منقول ہے کہ وہ کہا کرتے تھے۔ الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسماعیل و اسحاق۔

۳۳۔ مولانا مملوک علی

مولانا مملوک علی کے آبا و اجداد میں سے ایک شیخ محمد ہاشم ہیں۔ جن کا سلسلۂ نسب قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ شاہ جہاں نے آپ کو قصبہ نانوتہ میں جاگیر دی تھی۔ یہ لوگ وہیں بس گئے۔ ان کی اولاد سے بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے۔ جو حزبِ دہلوی کے نامی گرامی ارکان تھے۔

ان میں سے ایک مولانا استاد عصر مملوک علی بن احمد بن علی بن غلام شرف بن عبداللہ بن فتح بن محمد مفتی۔ بن عبدالسمیع بن شیخ محمد ہاشم ہیں۔ شیخ موصوف شیخ رشید الدین کے شاگرد ہیں، آپ عربی فقہ اور دوسرے علوم و فنون میں اپنے زمانے کے علماء سے ممتاز اور فائق تھے۔ دہلی کالج میں اپنے استاد مولانا رشید الدین کے بعد ان کو مدرسی کا منصب سپرد کیا گیا۔ ان کے

شاگردوں میں سے مولینا محمد مظہر نانوتوی، شیخ الاسلام مولینا محمد قاسم نانوتوی، عبدالرحمٰن پانی پتی، احمد علی سہارنپوری، مولینا رشید احمد گنگوہی، شیخ محمد یعقوب ابن مملوک علی اور ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ تھے۔ سید احمد دہلوی بانی جامعہ علی گڑھ، نذیر احمد مترجم قرآن اور مولوی ذکاء اللہ اور دوسرے نامور اہل علم کو بھی انکی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔

سر سید اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں" جناب مولوی مملوک علی شاگرد مولوی رشید الدین خاں علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرد۔ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہوجائے تو ان کے لوح حافظہ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے۔ چودہ پندرہ سال سے مدرسہ شاہجہاں آباد میں عہدۂ مدرسی رکھتے تھے۔ لیکن اب کئی سال سے سرکردہ مدرسین ہیں"۔

مولینا مملوک علی نے ۱۲۶۷ھ میں انتقال فرمایا۔ اور آپ کو مقبرہ امام ولی اللہ دہلوی میں دفن کیا گیا۔ آپ کے صاحبزادے شیخ محمد یعقوب مدرسہ دیوبند کے رئیس المدرسین مقرر ہوئے تھے۔ اور ان ہی سے ہمارے استاد حضرت شیخ الہند نے علم حاصل کیا۔ "تمہید"

مولینا مملوک علی سرکاری مدرسے کے ملازم تھے۔ ان کی نگرانی میں حزب دہلوی کا کام شبہات سے بالا رہ کر چل سکتا تھا۔ ورنہ ریذیڈنٹ کی نظر نہایت تیز تھی، مگر مولینا مملوک علی کو آزاد ساتھی چاہئیں۔ امیر امداد اللہ شاہ اسحاق کے مدرسے کے پرانے طالب علم اور ان کے داماد مولوی نصیر الدین کے شاگرد تھے

موصوف کی طبیعت عالمانہ رنگ کی نہ تھی۔ وہ امیر شہید سے ملتی جلتی طبیعت رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ سید صاحب شہید کا نمونہ تھے۔ مولینا محمد قاسم اور مولینا رشید احمد ان کے ساتھ اس طرح کام کرتے رہے۔ جیسے امیر شہید کے ساتھ مولینا عبد الحی اور مولینا اسماعیل تھے۔

۳۴ مولینا قطب الدین دہلوی

آپ شاہ محمد اسحاق صاحب کے خلیفہ ہیں۔ موصوف نے شرح المشکوۃ لکھی جس سے لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ اس کے علاوہ آپ کی اور کتابیں بھی ہیں۔ مولینا قطب الدین شاہ محمد اسحاق کے مخصوص اصحاب میں سے تھے۔ موصوف نے ۱۲۸۹ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا۔

۳۵ مولینا مظفر حسین کاندھلوی

آپ بڑے پرہیزگار خدا ترس نیکیوں کا حکم دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے تھے۔ موصوف نے اپنے چچا مفتی الٰہی بخش اور مولینا اسحاق سے پڑھا۔ اور مولینا محمد یعقوب دہلوی کی صحبت میں فیض رشد پایا۔ آپ مولینا اسحاق کے حجاز تشریف لے جانے کے بعد ہندوستان میں آپ کے نائب تھے۔ آپ ہی ہیں جنہوں نے شیخ الاسلام مولینا محمد قاسم دیوبندی کو منبر وعظ پر بٹھایا۔ مولینا موصوف کا دس محرم ۱۲۸۳ھ میں انتقال ہوا۔ اور بقیع میں دفن ہوئے۔ "تمہید"

۳۶ تاسیس مدرسہ دیوبند

حزب ولی اللہ کے مشائخ نے جو ۱۸۵۷ء اور اس سے پہلے ہجرت

کرکے حجاز تشریف لے گئے تھے فیصلہ کیا کہ مدرسہ دہلی کے نمونے پر دینی علوم کے لئے ایک درسگاہ قائم کی جائے۔ مدرسۂ دہلی امام عبدالعزیز کے زمانے میں بنا تھا اور اس کے اساتذہ میں سے مولٰینا عبدالحی دھلوی پھر شیخ رشید الدین دہلوی ان کے بعد مولٰینا مملوک علی دہلوی تھے۔ یہ مدرسہ ۱۸۵۷ء یعنی ۱۲۷۴ھ کے ہنگامہ میں بند ہو گیا تھا۔

امیر امداد اللہ، امام عبدالغنی دہلوی اور حزب دہلوی کے دوسرے مشائخ چاہتے تھے کہ حجاز میں ہندوستان کے اسلامی مرکز کو مضبوط بنائیں۔ اور سرحد کے پہاڑوں میں ہندوستانی تحریک کو از سرنو زندہ کرنے کے لئے کوئی اقدام کریں۔ ہندوستان میں امیر امداد اللہ کے نائب شیخ الاسلام مولٰینا محمد قاسم تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو ایک لسان (ترجمان) عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ شمس تبریزی کے واسطے مولٰینا رومی کو لسان بنایا۔ اور مجھ کو مولٰینا محمد قاسم لسان عطا ہوئے۔ جو میرے قلب میں آتا ہے، مولٰینا اس کو بیان کر دیتے ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی نے ایک مرتبہ حاجی امداد اللہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ فرماتے تھے۔ مولٰینا محمود حسن کو کم نہ سمجھو وہ اپنے زمانے کا شیخ ہوگا" تمہید"

۳۷ مولٰینا امداد اللہ

آپ بہت بڑے عارف، شریعت اور طریقت کے جامع اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے جہاد کرنے والے تھے۔ مولٰینا امداد اللہ فاروقی ہیں۔ آپ

کی پیدائش ۱۲۳۳ھ بمقام ناتوت ہوئی۔ آپ نے شیخ محمد قلندر، شیخ الٰہی بخش کاندھلوی اور شیخ نصیر الدین دہلوی سے پڑھا۔ جب بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد شہید شہادت پا گئے تو ان کی جماعت کے باقی ماندہ لوگوں نے مولینا نصیر الدین دہلوی کی بیعت کر لی۔ اس موقع پر حاجی امداد اللہ نے سب سے پہلے ان کی بیعت کی تھی۔ ۱۲۶۱ھ میں حاجی امداد اللہ حرمین گئے اور یہاں مولینا محمد اسحاق صاحب سے ملے۔ اور ان سے دعوت و ارشاد کا طریقہ اخذ کیا۔ بعد ازاں ۱۲۶۲ھ میں آپ پھر ہندوستان چلے آئے۔ حاجی امداد اللہ صاحب کا اصل نام امداد حسین تھا، جسے مولینا اسحاق صاحب نے بدل کر امداد اللہ کر دیا۔ حاجی صاحب کی ذات مرجع خلائق تھی اور آپ سے بے شمار اہل فن نے فیض پایا۔ ان میں سے مشہور مولینا محمد قاسم مولینا رشید احمد شیخ فیض الحسن سہارنپوری اور دوسرے نامی گرامی علمائے ہند ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں آپ معرکۂ شاملی کے امیر تھے۔ اس کے بعد موصوف چھپ کر حجاز پہنچ گئے۔ اور مکہ مکرمہ میں اقامت پذیر ہو گئے۔ حاجی امداد اللہ دیوبندی جماعت کے امیر تھے۔ آپ نے ۱۳۱۷ھ میں انتقال فرمایا۔ "تمہید"

۳۵۔ مولینا محمد قاسم

ابو ہاشم محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد علاؤ الدین بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبد السمیع بن محمد ہاشم نانوتوی۔ آپ ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ موصوف نے اپنے چچا مولینا مملوک علی سے، اور ان کے علاوہ مولینا عبد الغنی، مولینا احمد علی اور حاجی امداد اللہ وغیرہم سے اکتساب علم کیا۔

۱۲۸۳ھ میں آپ کے ہاتھوں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی۔ اور اس کے کہیں نو برس بعد ۱۲۹۲ھ میں مطابق ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء میں علی گڈھ کالج بنا تھا۔ مولینا محمد قاسم چودھویں صدی ہجری کے مجددین میں سے تھے۔ آپ نے ولی اللّٰہی حکمت ومعارف کو اہل ہند کے لئے زمانۂ حاضر کے لباس میں پیش کیا۔ موصوف سے بے شمار لوگوں نے فیض علم پایا تھا۔ اور ان میں سے ایک ہمارے استاد حضرت شیخ الہند ہیں، جو آگے چل کر دیوبندی تحریک کے تیسرے دور کے امام اور پیشوا بنے۔ مولینا محمد قاسم کی دعوت کا سارا انحصار امرا اور اصحاب ثروت کی بجائے اللہ تعالٰے کے بھروسہ سے ملت کے غریب طبقوں پر تھا۔ چنانچہ دیوبندی تحریک حتی الوسع طبقہ اُمرا کے ساتھ خلط ملط کرنے سے بچتی تھی۔ مولینا محمد قاسم نے ۱۲۹۷ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کی شخصیت مولینا اسماعیل شہید سے بہت مشابہ تھی۔

۳۹ مولینا رشید احمد گنگوہی

شیخ الاسلام ابو مسعود رشید احمد گنگوہی ہدایت اللہ انصاری کے صاحبزادہ ہیں۔ آپ ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اور مولینا مملوک علی، مولینا عبد الغنی، مولینا احمد سعید، مولینا امداد اللہ وغیرہم سے آپ نے تعلیم پائی۔ خود میں نے مولینا موصوف سے سنن ابو داؤد کا ایک بڑا حصہ پڑھا۔ اور اللہ تعالٰے نے مجھے اس سے بڑا نفع دیا۔ مولینا رشید احمد کی صحبت کا اثر ہے کہ میں ان کے مسلک پر اس طرح کاربند ہوا کہ مجھے اس سے ہٹنے کا کبھی خیال نہیں ہوا اور ان کی بدولت فقہ اور حدیث کے معاملہ میں ولی اللّٰہی طریقہ میرے سامنے واشگاف

ہو گیا۔ اور میں ان کی برکت سے فقہ۔ سلوک و معرفت، عربی زبان اور کتاب و سنت کے علوم میں اصول و معقول کو خوب جان گیا۔ میں نے مولٰینا رشید احمد کو فقہ حنفی کا ایک راسخ القدم امام و مجتہد پایا۔ آپ اپنے استاد مولٰینا عبدالغنی کے طریقہ فکر کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ اور اس راہ میں پہاڑ کی طرح غیر متزلزل تھے۔ آپ ولی اللہی مسلک میں مولٰینا محمد اسحاق سے بہت مشابہ ہیں۔ میں آپ کی کتاب "براہین قاطعہ" سے سنت اور بدعت کی حقیقت سمجھا۔ یہ کتاب موصوف نے شاہ اسماعیل شہید کی تصنیف "ایضاح الحق" کی حمایت میں لکھی تھی۔ مولٰینا رشید احمد امیر امداد اللہ اور مولٰینا محمد قاسم کے بعد دیوبندی جماعت کے امام ہوئے۔ آپ سے تین سو سے زیادہ مشائخ نے دینی علوم حاصل کئے۔ آپ کا سن وفات ۱۳۲۳ھ ہے۔

۹۔ حزب صادق پوری

بالاکوٹ کے حادثہ کے بعد باقی ماندہ مجاہدین نے امیر نصیر الدین دہلوی کے ہاتھ پر جو مولٰینا محمد اسحاق کے داماد تھے بیعت کی تھی۔ لیکن ان کی جماعت میں اختلاف رونما ہوا۔ بات یہ تھی کہ مجاہدین کو امیر شہید کا جنازہ نہ ملا تھا۔ چنانچہ اس کی وجہ سے ان کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ جو بیشتر ارباب حل و عقد پر مشتمل تھا امیر شہید کی شہادت کا قائل تھا۔ لیکن دوسرا گروہ جو تعداد میں کم تھا امیر شہید کی موت کا انکار کرتا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے بڑی مستعدی سے اس امر کی دعوت دینی شروع کی کہ امیر شہید زندہ ہیں، وہ شہید نہیں ہوئے، اور عنقریب لوٹ کر آئیں گے۔ امیر شہید کے متعلق یہ دو خیال بالاکوٹ کے

واقعہ کے بعد وہیں پیدا ہو گئے تھے۔ طبعاً ان کا اثر ہندوستان میں مدد گاروں کی جو جماعتیں تھیں، اُن پر بھی پڑا۔ مولانا محمد اسحاق اور ان کی جماعت امیر شہید کی شہادت کو تسلیم کرتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس مولانا ولایت علی عظیم آبادی (صادق پوری) کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ شہید نہیں ہوئے، بلکہ کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ مولانا ولایت علی شاہ اسماعیل شہید کے خواص اصحاب میں سے تھے۔ اور سید احمد شہید آپ کو دعوتِ جہاد کے سلسلہ میں ہندوستان بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ جب بالاکوٹ کا معرکہ ہوا تو مولانا ولایت علی وہاں موجود نہ تھے۔ اس لئے انھیں یقین تھا کہ سید احمد شہید کی شہادت نہیں ہوئی، یہ وجہ تھی جس کی بنا پر دونوں گروہوں میں اختلاف واقعہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام دشمن جماعتیں تو مسلمانوں کا مذاق اڑاتیں اور کفار تھے کہ بلادِ اسلامیہ پر قبضہ کرتے چلے جاتے تھے۔ جہاں تک شاہ محمد اسحاق کے بس میں تھا، وہ اور اُن کی جماعت اپنے کام میں لگی رہی لیکن تمام کوششوں کے باوجود دونوں گروہوں کا اختلاف رفع نہ ہو سکا۔ آخر کار مولانا محمد اسحاق ہجرت کر کے حجاز چلے گئے۔ اور مکہ میں ۱۲۶۲ھ میں آپ نے انتقال کیا۔ مولانا محمد اسحاق کی وفات کے بعد حزب ولی اللہ دو مستقل جماعتوں میں بٹ گئی۔ ایک جماعت حزب دہلوی کہلوائی۔ اور دوسری حزب صادق پوری تھی۔

امیر ولایت علی کی جماعت میں عام طور پر بہار و بنگال والوں کی کثرت تھی۔ آپ نے از سر نو بیعتِ جہاد کی دعوت دینی شروع کی اور اپنے آپ کو امیر شہید کا نائب قرار دیا۔ یہ ۱۲۴۸ھ کا واقعہ ہے، مولانا ولایت علی کی جماعت

کا مرکز صادق پور تھا۔ اس لئے اس جماعت کا نام حزب صادق پور پڑا۔ مولینا ولایت علی کے ساتھ مولینا عبدالحق بن فضل اللہ بنارسی بھی شریک ہو گئے۔ موصوف شاہ اسماعیل شہید سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ اور آپ نے امام شوکانی سے بھی پڑھا تھا۔ ان لوگوں نے حزب صادق پوری کی تنظیم کا باقاعدہ کام کرنا شروع کر دیا۔ البتہ شاہ محمد اسحاق کے احترام کے پیش نظر یہ دہلی اور اطراف دہلی میں اپنی جماعت کا کھلم کھلا پروپگنڈا نہ کرتے۔ امیر ولایت علی ۱۲۵۰ھ میں حجاز گئے اور وہاں سے یمن پہنچے اور امام شوکانی سے استفادہ کیا۔

مولینا محمد اسحاق ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے۔ تو امیر ولایت علی نے ۱۲۵۸ھ میں اپنے بھائی عنایت علی کو سرحد پار بونیر کے مقام پر بھیجا جہاں امیر شہید کے باقی ماندہ مجاہدین ان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ۱۲۶۲ھ میں جب مولینا اسحاق کا انتقال ہوا تو امیر ولایت علی خود بھی بونیر پہنچ گئے، اور وہاں ایک حد تک ان کو کامیابی بھی ہوئی۔ ۱۲۶۹ھ میں امیر ولایت علی فوت ہوئے۔ اور ان کی جگہ ان کے بھائی عنایت علی امیر بنے۔ مجاہدین کی یہ جماعت امیر شہید کا برابر انتظار کرتی رہی۔ اور اس اثنا میں ان کا جہاد اور لڑائی شروع کرنے پر اتفاق نہ ہو سکا۔

در اصل حزب صادق پوری کا اساسی عقیدہ یہ تھا کہ امیر شہید غائب ہو گئے ہیں۔ اور وہ ضرور لوٹیں گے۔ یہی سبب تھا کہ جب مسلمانوں کے اور امرا اور سلاطین کفار کے خلاف لڑنے کے لئے اُٹھے۔ تو حزب صادق پوری ان سے بے تعلق رہی کیونکہ امیر شہید کے ظہور سے پہلے ان کے نزدیک کفار سے جہاد

کیسے ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود امیر عنایت علی کی جماعت میں ایسے مجاہدین بھی تھے جو اس خیال سے اتفاق نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اس معاملہ ان کا میلان طبع حزب دہلوی کی طرف تھا۔

حزب صادق پوری کے اکابر ائمہ میں سے ایک شیخ الاسلام سید نذیر حسین بہاری ثم دہلوی ہیں۔ آپ ۱۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۲۳۷ھ تک صادق پور ہی میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۲۴۳ھ میں آپ دہلی آئے۔ اور مولانا اسحاق سے پڑھا۔ اور اس کے علاوہ خود مولانا اسحاق سے بھی استفادہ کیا۔ آپ نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ اور آپ کی ذات علوم نقلی، علوم عقلی اور ادبیات سب کی جامع تھی۔ آپ اپنے استاد مولانا اسحاق کے تتبع میں حنفی فقہ کے مطابق فتوے دیتے تھے۔ فتاوی عالمگیری پر آپ کی اتنی نظر تھی کہ گویا آپ کو یہ ازبر یاد تھے۔ در اصل مولانا نذیر حسین کا رجحان حزب صادق پوری کی طرف بہت کم تھا۔ ۱۲۷۴ھ کے بعد آپ مستقل طور پر خود اجتہاد فرماتے اور اکثر معاملات میں شاہ اسماعیل شہید کا تتبع کرتے۔

حزب صادق پوری میں سے ایک نواب صدیق حسن خاں ہیں۔ موصوف امیر ولایت علی سے ملے تھے اور شیخ عبد الحق بنارسی سے آپ کو تلمذ حاصل تھا۔ اس کے علاوہ علمائے یمن سے بھی آپ نے استفادہ کیا۔ اور خاص طور پر امام شوکانی سے موصوف کو بڑا شغف تھا۔ "التمہید" صفحہ ۱۴۶

علاوہ ازیں حزب دہلوی اور حزب صادق پوری کے متعلق "التمہید" صفحہ ۱۴۸ میں لکھا ہے کہ حزب دہلوی کا شاہ اسماعیل شہید اور مولانا محمد اسحاق

کی طرف میلان تھا۔ اور ان کے مقابلہ میں حزب صادق پوری سید احمد شہید کی طرف زیادہ میلان رکھتی تھی، لیکن دونوں کی دونوں جماعتیں امام ولی اللہ اور ان کے بعد امام عبدالعزیز اور ان کے بعد سید احمد شہید کے ماننے میں متفق تھیں۔ بعد میں حزب صادق پوری کا میل وجول "ظاہریہ محدثین" یمن کے زیدیوں اور نجد کے حنبلیوں سے بڑھا۔ اور اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ شاہ اسماعیل شہید کے مسلک سے الگ ہو گئے۔ اور دونوں جماعتوں کے علوم و معارف میں بھی بڑا اختلاف پیدا ہو گیا۔

اگر شاہ اسماعیل کی "تقویۃ الایمان" اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی "کتاب التوحید" کو غور سے پڑھئے تو مشرک کی عدم مغفرت اور توسل فی الدعا کے معاملہ میں دونوں میں صاف نظر آئے گا۔ اسی طرح اگر شاہ اسماعیل شہید کی "اصول فقہ" اور امام شوکانی کی "ارشاد الفحول" دیکھئے تو اجماع کے مسئلہ میں دونوں اختلاف پایا جاتا ہے۔ نیز اگر شاہ شہید کی کتاب "العبقات" پڑھئے تو ابن عربی کے فلسفہ کے متعلق ان کی رائے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے حنبلی پیرووں سے بالکل الگ ہے۔ چنانچہ مولانا نذیر حسین دہلوی ابن عربی کو کافر نہ قرار دینے کے معاملہ میں شاہ اسمعیل شہید کے متبع تھے۔ کتاب "الحیات بعد الممات" میں لکھا ہے۔ میاں صاحب طبقہ علمار کرام میں شیخ محی الدین ابن عربی کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ اور انھیں "ختم الولایۃ المحمدیہ" کہہ کر پکارتے تھے۔ مولانا بشیر الدین قنوجی جو شیخ اکبر کے مخالف تھے۔ ایک مرتبہ دہلی اسی غرض سے تشریف لائے کہ ان کے بارے میں میاں صاحب سے مناظرہ کریں۔ دو مہینے دہلی میں رہے۔

روزانہ مجلس مناظرہ گرم ہوئی۔ مگر میاں صاحب اپنی عقیدتِ سابقہ سے جو شیخ اکبر سے تھی، ایک تل برابر بھی پیچھے نہ ہٹے۔ آخر مولینا ممدوح دو ماہ کے بعد واپس تشریف لے گئے۔ علیٰ ہذا القیاس مولانا ابو الطیب شمس الحق نے بھی شیخ اکبر کے متعلق کئی دن تک متواتر میاں صاحب سے بحث کی۔ اور "فصوص الحکم" پر اعتراضات کئے۔ میاں صاحب نے پہلے تو سمجھایا۔ مگر جب دیکھا کہ ابھی "لانسلم" ہی کے کوچے میں ہیں تو فرمایا کہ "فتوحاتِ مکیہ" شیخ اکبر کی آخری تصنیف ہے۔ اور اس لئے ان کی سب تصانیفِ ماسبق کی ناسخ ہے۔ اس جملہ پر وہ سمجھ گئے (یہ بیان یہاں ختم ہوا)

نواب صدیق حسن خاں نے بھی اپنی کتاب "التاج المکلل" میں ابن عربی کی عدم تکفیر کی رائے دی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ ابن عربی کے معاملہ میں صحیح نقطۂ نظر وہی ہے جس پر محقق علمار جو علم وعمل اور شرح وسلوک دونوں کے جامع ہیں، عامل ہیں۔ اور وہ یہ کہ، ان کے مسلک کے متعلق سکوت اختیار کیا جائے۔ اور ان کے ہاں جو باتیں بظاہر شریعت کے خلاف ہیں، ان کی اچھی تعبیر کی جائے۔ اور ان کی تکفیر سے زبان کو روکا جائے۔ ان کے علاوہ اور جو مشائخ گذرے ہیں، جن کا تقویٰ سب کے نزدیک مسلّم تھا۔ اور ان کے علم وفضل کو سب مسلمان مانتے تھے اور عمل صالح میں وہ بلند مقام رکھتے تھے، ان کے معاملے میں بھی یہ مسلک اختیار کرنا چاہئے۔

۱۴۔ مولینا احمد علی سہارنپوری

آپ کے والد کا نام لطف اللہ انصاری تھا۔ موصوف نے مولینا

مملوک علی، مولانا وحید الدین سہارنپوری اور مولانا شاہ محمد اسحاق سے پڑھا۔ تحصیل علم کے بعد کچھ عرصہ آپ تعلیم و تدریس میں مصروف رہے۔ پھر آپ نے دہلی میں مطبع احمدیہ کے نام سے ایک چھاپہ خانہ قائم کیا اور اس میں قرآن عظیم اور حدیث کی کتابوں کو بڑی صحت کے ساتھ چھاپا۔ آپ اپنے عہد میں حدیثوں کے حافظ تھے۔ موصوف نے شیخ الاسلام محمد قاسم کے ساتھ مل کر صحیح بخاری پر حاشیے لکھے۔ اس کے علاوہ آپ نے حدیث کی اور بہت سی کتابوں کی (یعنی شرحیں) لکھیں۔ جن کی وجہ سے ملک کے اطراف میں علم حدیث کو بڑا فروغ ہوا۔ آپ سے شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم اور ہمارے استاد حضرت شیخ الہند نے بھی استفادہ کیا۔ مولانا احمد علی نے ۱۲۹۷ھ میں انتقال فرمایا (تمہید ص۲۲۶)

۵۴۲ مولانا شیخ محمد تھانوی

تھانہ بھون کے یہ بزرگ مولانا شیخ محمد تھانوی محدث کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی رائے ۱۸۵۷ء کی تحریک حریت کے خلاف تھی۔ مولانا حسین احمد صاحب صدر دیوبند نے ایک مرتبہ سہارنپور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ امیر امداد اللہ اور شیخ الاسلام محمد قاسم اور حضرت مولانا گنگوہی وغیرہ حضرات نے مولانا شیخ محمد کی مسجد میں جا کر جہاد حریت کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔ مولانا شیخ محمد نے اہل ہند کی بے سروسامانی کا ذکر فرما کر جہاد کی مخالفت کی۔ مولانا محمد قاسم نے فرمایا کہ کیا ہم اصحاب بدر سے بھی زیادہ کمزور ہیں؟ امیر امداد اللہ نے طرفین کی گفتگو سننے کے بعد فرمایا۔ کہ الحمد للہ انشراح ہو گیا۔ اور واپس آکر جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ امیر امداد اللہ نے امامت

قبول کی۔ اور شیخ الاسلام نانوتوی سپہ سالار قرار پائے۔ اور شیخ الاسلام گنگوہی قاضی مقرر ہوئے۔ اس طرح قصبہ تھانہ بھون ایک دار الاسلام بنالیا گیا۔ پھر پیش قدمی کر کے قصبہ شاملی ضلع مظفر نگر بھی فتح کر لیا۔ ش۔ م صفحہ ۶۷

شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں جن کے مسلک پر مولانا اشرف علی صاحب کاربند ہیں۔ اور شیخ الہند کی جماعت کی سیاست کو غلط مانتے ہیں۔ مولانا اشرف علی صاحب کے سوانح حیات جو شائع ہو چکے ہیں ان میں تصریح ہے۔ کہ آپ مولانا شیخ محمد صاحب کے مسلک کے پیرو ہیں۔ مولانا شیخ محمد اور امیر امداد اللہ ایک ہی مرشد کے خلیفہ ہیں۔ اور اسی مسئلہ جہاد پر آپس میں مخالف ہو گئے اور جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، تو اب امیر امداد اللہ کی جانشینی کا استحقاق مولٰینا اشرف علی صاحب کو کس طرح پہنچ سکتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی خطرناک استادی ہے۔ جو مولٰینا شیخ الہند اور ان کے اساتذہ کے خصوصی کاموں کو بیکار بنا دینا چاہتی ہے۔

۳۵ مولٰینا محمود الحسن

مولٰینا محمود الحسن شیخ الہند میرے استاد تھے۔ اور دار العلوم دیوبند کے زمانہ قیام میں میرا ان پر تمام تر اعتماد تھا۔ آپ کے والد کا نام ذوالفقار علی تھا۔ موصوف کا سلسلۂ نسب قریش کے اموی خاندان سے ملتا ہے۔ مولٰینا محمود الحسن ۱۲۶۸ھ یا ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتابیں آپ نے اپنے والد اور چچا سے پڑھیں۔ ۱۲۸۳ھ یا ۱۸۶۶ء میں جب مدرسہ دیوبند کی بنیاد پڑی تو مولٰینا اس میں داخل ہوئے۔ اور مولٰینا محمد یعقوب بن مملوک علی اور مولٰینا محمود دیوبندی

سے پڑھا۔ آپ شیخ الاسلام مولینا محمد قاسم کی صحبت میں رہے۔ اور موصوف سے بہت استفادہ کیا۔ آپ نے مولینا احمد علی۔ شیخ محمد مظہر نانوتوی اور شیخ عبدالرحمٰن پانی پتی سے "تدریس و تعلیم کی اجازت طلب کی۔ اور ان سب بزرگوں نے موصوف کو اس کام کا اہل پاکر اجازہ علمی سے مرحمت فرمایا۔ نیز شیخ الاسلام محمد قاسم مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ تو وہاں مولٰینا عبدالغنی سے بھی مولٰینا محمود الحسن کے لئے "اجازہ علمی" حاصل کیا۔ اس کے علاوہ اپنے استاد مولٰینا محمد قاسم کی تعمیل ارشاد کرتے ہوئے آپ نے حاجی امداد اللہ سے بھی اکتساب فیض کیا۔ جن بزرگوں نے شیخ الاسلام مولٰینا محمد قاسم سے علم حاصل کیا تھا۔ ان میں سے تین حضرات خاص طور پر مشہور اور ممتاز ہوئے۔ لیکن ان میں سے حضرت شیخ الہند کو اپنے استاد سے سب سے زیادہ محبت تھی۔ اور وہ ان کے علوم پر سب سے زیادہ حاوی تھے۔ اور ان کے اتباع میں موصوف کو سب سے زیادہ شغف تھا۔ میں (مولٰینا) نے آپ سے شیخ الاسلام مولینا محمد قاسم کی کتاب "حجۃ الاسلام" پڑھی۔ کتاب پڑھتے پڑھتے کبھی کبھی میں یوں محسوس کرتا۔ جیسے علم اور ایمان میرے دل میں اوپر سے نازل ہو رہا ہے۔ حضرت شیخ الہند کی ذات اقدس کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ وہ فطرتاً بڑے ذکی اور ذہین تھے! اور موصوف کا شمار ان بزرگوں میں سے ہو سکتا ہے جنہیں امام ولی اللہ کی اصطلاح میں "مفہمین" کہا جاتا ہے۔ آپ اپنے استاد سے بڑی عقیدت رکھتے اور ان کی متابعت میں ہر دم کوشاں رہتے۔ آپکو شیخ الاسلام مولٰینا محمد قاسم سے تواضع اور انکسار کی نسبت تھی۔ اسی نسبت کو امام ولی اللہ نے اپنی کتابوں میں نسبت اہل بیت کا نام دیا ہے۔ حضرت شیخ الہند نے ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو امام عبدالعزیز کی وفات کے پورے سو سال بعد انتقال فرمایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ

کھول کر آنکھیں میرے آئینہ گفتار میں   آنیوالے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اِنَّ وَلِيِّيَ اللهُ الَّذِي نَزَّلَ
الْكِتَابَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِينَ

الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ علی سیدنا محمد سید المرسلین و خاتم النبیین وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ من آئمۃ الدین وعباد اللہ الصلحین وبارک لہ

اما بعد آج ہم نے خدا کا نام لے کر اسی کی مدد پر اعتماد کر کے شمال مغربی ہند کی نئی سیاسی جماعت "جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی" کے پہلے حصہ کا کام سندھ میں شروع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

پارٹی کے چند اساسی قواعد ہم نے ضبط کر لئے ہیں تاکہ خواص کو دعوت دینے میں آسانی ہو۔ ان میں اکثر وہی باتیں ہیں جو سیاسی مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک علوم متعارفہ کا حکم رکھتی ہیں۔ اس لئے ان کی مزید تشریح کی اس مقدمہ میں ضرورت نہیں۔ البتہ پارٹی کے میدان عمل کو محدود کرنے کا مسئلہ قابل وضاحت ہے

جس مبصر کو گذشتہ تین سو برس کی تاریخ پیش نظر ہے۔ وہ سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان کا سیاسی تقدم اتنا مشکل نہیں جیسا کہ اس سے پہلے سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ امر بھی ساتھ ہی منکشف ہو جاتا ہے کہ یہ کھیل جب کبھی بن کر بگڑتا ہے تو اس کی تہ میں ہندو مسلم اختلاف ہی باعث نقصان نظر آتا ہے۔

اس اختلاف کو حل کرنے کے لئے متفرق طور پر سیاسی نظریات بنائے گئے مگر

عملاً مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کا منظر سامنے آتا ہے۔

ہم نے علمی اشتراک کے ساتھ ساتھ فکری اتحاد کا ضمیمہ بھی لگا دیا ہے۔ اس طرح ہم ایک نیا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے ہم نے ایک ایسا قطعہ انتخاب کیا ہے جو دونو تہذیبوں کا مرکز ہے۔

جس طرح گنگا جمنا کا دوآبہ ہندو تہذیب کا منبع ہے۔ اسی طرح سندھ ساگر مسلم تہذیب کا معدن ہے۔ اگر ہم ان دو عظیم الشان قطعات کا اپنے نظریہ پر سمجھوتہ کرا سکے اور ان کی تالیف قلوب پر قادر ہو سکے۔ تو اس لاینحل مشکل کی کلید مل جائے گا۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اسکندریہ میں حکمار کا ایک طائفہ نو فلاطونی پیدا ہوا تھا۔ اسی منہاج پر مسلمانوں میں کئی حکیم پیدا ہوئے جن میں سے الشیخ الاکبر محی الدین ابن عربی اور شیخ الاشراق شیخ شہاب الدین السہروردی مشہور عالم ہیں۔

ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی کے زمانہ سے صوفیہ کرام کی آمد شروع ہوئی سلطان شہاب الدین غوری کے بعد اس خاک سے تصوف کے چاروں طریقوں میں کثرت سے معرفت الٰہی میں کامل خادم انسانیت پیدا ہوئے۔ وہ سب اسی خدمت اشراقی کے امام تھے۔ مگر ایسا عالم جو اپنے انکشافات اور نظریات کی تدوین و تنظیم پر قادر ہو، امام ولی اللہ دہلوی جیسا پیدا نہیں ہوا۔

ان تمام ائمہ تصوف کا مرکزی فکر وحدت الوجود ہے۔ جو ویدانت فلاسفی کا اصل اصول ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اسی کی تہذیب و تکمیل سے انسانیت کی تشریح کی اور اسی کو کتاب و سنت کا بطن بنایا جیسا کہ انکی معرکۃ الآرا، کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" اور ان کی فلسفی تصانیف "البدور البازغہ" و "التفہیمات الالہیہ" وغیرہ سے واضح ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں اگر دونوں مذاہب کے خدام انسانیت اسی فلاسفی کو امام بنا کر تقدم کی جد وجہد میں مصروف ہو جائیں۔ تو ہند ایک دفعہ پھر مجمع البحرین بن کر

دُنیا کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

ہمارے پرانے رفقا میں سے اگر کوئی بزرگ ہمارا نیا انداز دیکھ کر چین بجبیں ہوں تو اُن کی خدمت میں مختصراً عرض ہے کہ ہمارا اصلی مخاطب ہندوستانی نوجوان ہے ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند　جوانانِ سعادت مند پندِ پیرِ دانا را

جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کا پروگرام

۱۔ دار الرشاد، السواد الاعظم، قاسم المعارف کے پرانے کارکن اور اُن کے رفقا جو وطنی خدمت کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کے اندر ایک مستقل پارٹی تشکیل کرتے ہیں۔ جسے شمال مغربی ہند کے محدود رقبہ جات سے تعلق ہوگا۔

(ا) پارٹی کا نام جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی ہوگا۔

(ب) اس پارٹی کا میدان عمل چار حصوں میں منقسم ہوگا۔

(۱) آج کا صوبہ سندھ جس کا مرکز کراچی ہے۔

(۲) دریائے سندھ اور اسکے معاونین کی زمین جس کا مرکز لاہور ہے۔

(۳) دوآبہ گنگا جمنا اور اسکا زیر اثر اجمیری بنارسی علاقہ جسکا مرکز دہلی ہے

(۴) ہند کا ایسا حصہ جو اپنے فیصلہ سے پارٹی میں شامل ہو۔

۲۔ اس پارٹی کے نظری اساسی اصول یہ ہیں:۔

(ا) عدم تشدد کی پابندی سے کامل آزادی حاصل کرنا۔

اس تاریخی حقیقت کو یاد رکھنا چاہیئے کہ مسیحیت نے عدم تشدد کی پابندی سے تین سو برس میں استقلال حاصل کیا تھا۔

(ب) کاشتکار اور دستکار محنت کش کی معاشی حالت درست کرنا اور اسے ترقی دے کر یورپ کے محنت کش کے برابر بنانا۔

جب تک ملک کی عام آبادی کی معاشی حالت ترقی نہ کرے، سیاسی ترقی ناممکن ہے۔

(ج) ہند کو ایک ملک نہیں بلکہ یورپ کی طرح مجموعہ ممالک ماننا۔ زبان اور معاشرت کو ملکی تقسیم کا اساس بنانا۔

(د) ہر ایک ہندوستانی ملک یعنی جس میں ایک زبان بولی جاتی ہے اور اس کی معاشرت میں تقریباً یکسانی ہے۔ اس میں مستقل رہائش رکھنے والے ہر مرد اور عورت کا مساوی حق ماننا اور جمہوری نظام پر قومیت کو ترقی دینا۔ نسل، مذہب اور قدامت کو تفوق کا ذریعہ نہ بنانا۔

(ہ) ہر ایک ہندوستانی ملک کی عام آبادی کو اسکی مادری زبان میں تعلیم دے کر ووٹ کی قیمت سمجھانا۔

جو ہندوستانی زبانیں عربی حروف میں لکھی جاتی ہیں۔ انکی تعمیم تعلیم موجودہ رسم الخط کے ذریعہ سے نہایت دشوار ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ یا تو حروف علیحدہ علیحدہ لکھنے کا رواج دیا جائے۔ یا رومن حروف میں لکھنا شروع کردیں۔ دوسری صورت میں ٹائپ رائٹر سے باسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم چونکہ جبری قوت استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لئے سمجھا بجھا کر بالتدریج کامیابی حاصل کریں گے۔

(و) ترقی یافتہ یورپ کی صنائع کو اپنے ملک میں پیدا کرنے کے لئے اور وطن کی خدمت اور حفاظت میں مرد و عورت کو جوانمردی سکھلانے کے لئے یورپین معاشرت اختیار کرنا۔ یورپین قوموں کی سیاسی برادری میں شامل ہوئے بغیر نہ تو ایشیا کی سیاسی ترقی آسان ہے نہ ہندوستان کی۔ اس لئے معاشرتی انقلاب خوشی سے برداشت کر لینا چاہیئے۔ ورنہ ارتجاعی قوتیں ملک کو خاک سیاہ بنادیں گی۔

(ز) فکر اور اخلاق اور سیاست میں یکسانی پیدا کرنے کیلئے امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت اور فلسفہ کو پارٹی کا عقلی اساس ماننا اور اس راستہ سے انسانیت کی خدمت کیلئے تیار کرنا۔

دوسری ہزار ہجری کے ابتدا سے یعنی جلال الدین اکبر کے زمانہ سے مسلمانانِ ہند کے مفکرین کا ایک طبقہ ابن عربی کے فلسفہ یا ویدانت فلاسفی کی اصلاح اور تکمیل میں اس لئے مصروف رہا۔ کہ اسے ہندوستانی زندگی کے لئے سیاسی اساس بنائے۔ امام ولی اللہ دہلوی کا فلسفہ ان تمام مساعی کا نچوڑ ہے۔ اس سے تمام ادیان میں تطبیق دی جاسکتی ہے۔ نیز انسانیت کی ارتقائی تاریخ کی تشریح ہو سکتی ہے۔

(ح) ہندوستان کی وحدت کو فیڈریشن میں منحصر سمجھنا۔

ہندوستان کو ایک ملک سمجھنا اسی قدر غلط ہے جیسے کوئی روس کو نکال کر باقی یورپ کو ایک قوم کا ملک کہا کرے۔

(ط) فیڈریشن کی تکمیل کے لئے ایک کافی لمبی مدت تک برٹش کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کرنا۔

(ی) فیڈریشن کی زبان ترقی یافتہ ہندوستانی (اردو) اور انگریزی کو ماننا۔

اردو کو رومن حروف میں لکھ کر یورپین قوموں میں رواج دینا۔ اور مقطع حروف میں لکھ کر ایشائی قوموں میں پہنچانا، اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

۳۔ پارٹی کے عملی سیاسی اصول یہ ہیں۔

(ا) پارٹی اپنے نظریات کو پھیلانے کیلئے خاص تعلیمگاہوں میں خدام خلق تیار کریگی۔ فقط وہی لوگ پارٹی کے ممبر بن سکیں گے۔ جو انسانیت کی خدمت کو اپنا فرض قرار دیں گے اور عدم تشدد کی پابندی سے اس فرض کی تعمیل میں ہر قسم کی مشقت برداشت کرنے کا عہد کریں گے کہ وہ تکلیف دینے والوں پر کسی صورت میں ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔

(ب) پارٹی کے جس قدر ممبر حکومت میں شریک ہونگے وہ اپنی کرسی پر ملک کے ہر فرد کے ساتھ یکساں معاملہ کریں گے اور رشوت لینا بند کرائیں گے۔

(ج) پارٹی کے تجارت پیشہ ممبر ناپ اور تول میں کمی بیشی نہیں کریں گے۔ حساب لکھنے میں خیانت نہیں کریں گے۔ سود بند کرائیں گے۔

(د) پارٹی کے زمیندار ممبر کاشتکار سے جو معاہدہ کریں گے۔ اسکے پابند رہیں گے۔ کاشتکار کے خاندان کی بڑھتی ہوئی ضروریات زندگی بہم پہنچانے میں پوری مدد دیں گے۔

(ہ) پارٹی کے کاشتکار ممبر حکومت کا مقررہ خراج اور زمیندار کا حصہ معاہدہ کی پابندی سے پورا کریں گے۔

(و) پارٹی کے دستکار ممبر جس سے معاملہ کریں گے۔ امانت کو اپنا شعار بنائیں گے۔

(ز) پارٹی کے جسقدر ممبر علمی یا اخلاقی خدمت کرنے کے لئے مخصوص ہیں، وہ اپنے ملک سے جہالت دور کرنے میں انتہائی جدوجہد کرینگے۔ وہ ادنیٰ ضروریاتِ زندگی پر اکتفا کریں گے۔

(ح) پارٹی کے ہر علمی ممبر کا فرض ہوگا۔ کہ وہ ہر مرد و عورت کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔

(۱) اپنی ملکی زبان میں۔

(۲) اپنی بین الاقوامی زبان میں۔

(۳) ہر پابند مذہب کو اس کی مذہبی زبان میں۔

(ط) پارٹی کے ہر اس ممبر کا جو اخلاقی استاد یا مرشد مانا جاتا ہے فرض ہوگا۔ کہ وہ اپنے ملکی بھائیوں کو حقوق کا احترام سکھلائیں۔ یہاں تک کہ ان کے ملک کا ہر شخص کسی انسان کے جان، مال، عزت کو نقصان پہنچانا اخلاقاً حرام سمجھے۔

(ی) پارٹی کا ہر ممبر اپنی ضروریات زندگی خود کما کر حاصل کرے گا۔ اس کا فرض ہوگا۔ کہ ملک سے بیکاری کی زندگی کو ختم کردے۔ ہر امیر و غریب کو کسی نہ کسی طریقہ سے محنت کش بنایا جائے۔

عبید اللہ سندھی